1183

उर्दू संग्रह

पुस्तक का नाम हर्फ आगाज़

लेखक अमीरकी सफाहरबाना

प्रकाशन वर्ष

आगत संख्या 1183

CC-0.

1183

1183;U

पुस्तकालय
1183

فہرست مضامین

حرفِ آغاز ۵
:- محلِ وقوع اور تبدیلیِ وطن ۷
:- امریکی کردار اور معیشت ۱۲
:- سیاست اور امریکی کردار ۲۵
:- ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں مذہب ۳۴
:- ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں رضاکار جماعتیں ۳۷
:- مختلف طبقوں اور اقلیتوں سے سلوک ۴۰
:- فنونِ لطیفہ ۴۶
:- کُنبہ ۷۱
:- ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں تعلیم ۷۳
:- عالمی امور میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ ۷۸

1183;U

جے اگز

© Institute of International Education
New York City

حرفِ آغاز

مصنفین طویل عرصے سے امریکی کردار کا مطالعہ کرتے آرہے ہیں۔ جب ۱۷۷۶ء میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے برطانیہ عظمےٰ سے اپنی آزادی کا اعلان کیا تو قدرتی بات تھی کہ اس سے غیر ملکوں میں بہت دلچسپی پیدا ہوئی۔ نو آبادیاتی انقلابات کے لامتناہی سلسلہ کی یہ پہلی کڑی تھی۔ مزید برآں یہ تغیر اُس وقت رونما ہُوا۔ جبکہ یورپ میں بھی اسی قسم کی بے اطمینانی پیدا ہو رہی تھی۔

نئی امریکی سرکار کو جمہوریت کے ایک اہم تجربے کی حیثیت دی گئی۔ جرمن فلاسفر ہیگل نے یہ کہہ کر کہ "امریکہ مستقبل کی سرزمین ہے۔ جہاں تاریخ عالم آنے والے ادوار میں اپنا رُخ طے کرے گی" عمومی جذبات کا اظہار کیا تھا۔

انیسویں صدی کے اوائل میں بہت سے غیر ملکی امریکہ کے مطالعہ کے لئے آئے۔ فرانسیسیوں نے جنگی حکومت نے امریکی انقلاب کی حمایت کی تھی۔ خاص طور پر دلچسپی کا اظہار کیا۔ گہری نظر رکھنے والے فرانسیسیوں میں کاونٹ الیکسس ڈی ٹوکی ول Count Alexis de Tocqueville بھی تھے۔ جن کی عظیم کتاب "امریکہ میں جمہوریت" ۱۸۳۵ء اور ۱۸۴۰ء میں شائع ہوئی اور جو اب بھی بصیرت افروز ہے۔ جن خصوصیات کا تجزیہ اِس کتاب میں کیا گیا ہے۔ ان میں اب تک بھی کوئی بڑی تبدیلی نہیں ہوئی۔

ڈی ٹوکی ول نے لکھا "مجھے اس امر کا اعتراف ہے کہ مَیں نے امریکہ میں امریکہ سے کچھ زیادہ پایا۔ یہ سمجھنے کیلئے کہ اس کی ترقی سے ہمیں کیا توقعات باندھنی ہیں اور کِن خدشات کو پالنا ہے۔ مَیں نے جمہوریت کے خود عکس کی بمعہ اس کے میلانات۔ کردار۔ تعصبات اور جذبات کے تلاش کی۔"

غیر ملکی سیاح کیونکہ مُلک کے ساتھ ساتھ اس کے سیاسی نظام کا مطالعہ بھی کر رہے تھے۔ لہٰذا انہوں نے اپنے مختلف سیاسی معیار اور رجحانات کے مطابق ہی امریکہ کے بارے میں حکم لگائے ہیں۔

ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ اکثر سیاح امریکہ کی چند ایک خصوصیات پر یک زبان تھے۔ انہوں نے امریکہ کو مضطرب۔

مستعد۔ پُرعمل۔ دوست دار۔ بےتکلف۔ ملنسار۔ اخلاق پرست۔ پُراُمید۔ مساوات پسند اَور ماضی کی جگہ مستقبل سے دِلچسپی لینے والا پایا۔ بہت کم سیاحوں نے اِس امر کو محسوس کیا ہے کہ امریکی کِتنے قدامت پسند ہیں۔ اَور اُنہوں نے بھی اُن اعتقادات کا پتہ نہیں لگایا جن کے تابع امریکی عمل کرتے ہیں۔ یہ اعتقادات کچُھ ایسے ہیں کہ خود امریکی بھی بمُشکل اس کی تعریف کر سکتے ہیں۔

لیکن زیرِ نظر کتاب کا مقصد مندرجہ ذیل اَور اسی قِسم کے دوسرے سوالات کا جواب دینا ہے۔ یعنی امریکیوں کو خود اپنا مُلک کیسا نظر آتا ہے؟ امریکی آپس میں کِن باتوں پر زیادہ بحث کرتے ہیں؟ ان کی توجہ کن خاص سماجی اور ثقافتی مسائل پر مرکوز رہتی ہے؟ اَور عام طور پر تعلیم یافتہ امریکی ماضی کے کِن واقعات اور کون کونسی کتابوں کا حوالہ دیتے ہیں؟

مقصد یہ ہے کہ امریکی اداروں اور امریکیوں کے اندازِ فکر اور تعداد کا تعلق بیان کرتے ہُوئے یہ دکھایا جائے کہ امریکہ جو کچُھ کہ اب ہے، وُہ کیسے بنا۔ مُلکی اور غیر مُلکی مبصرین اِس امر پر متفق ہیں کہ امریکہ کی چند ایک خصوصیات ایسی ہیں جو نوآبادیاتی اَیّام کے آغاز سے بدستور چلی آرہی ہیں۔ اگرچہ ان خصوصیات سے جغرافیائی اور تاریخی وجُوہ میں تبدیلی آگئی ہے۔ یا وُہ معدوم ہو گئے ہیں۔ تاہم امریکی ثقافت میں یہ خصوصیات تاحال نمایاں ہیں۔ اور خاص طور پر ہر امریکی اس کو اپنا طرّۂ امتیاز سمجھتا ہے۔

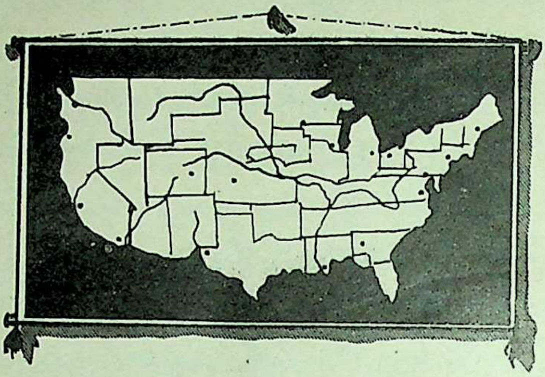

محلِ وقوع اور تبدیلیِ وطن

عام طور پر امریکی ثقافت کی تشریح کرنے والوں کے دو گروہ ہیں۔ ایک وُہ گروہ جو زیادہ قومی اور رومانی ہے۔ اور امریکہ کے بے مثل ہونے پر زور دیتا ہے۔ اور دوسرا گروہ وُہ جو اس نظریے سے اختلاف رکھتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ امریکی اداروں اور تصوّرات کا منبع یورپ ہے۔ اور امریکہ کی اقتصادی اور سماجی ترقیاں دوسرے کئی مُلکوں کے مساوی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ امریکی ثقافت مغربی یورپ کی ایک شاخ ہے۔

پہلا گروہ بڑی حد تک ایک مُورخ فریڈرک جیکسن ٹرنر کے نام نہاد نظریۂ سرحد کا مرہونِ منت ہے جس کا اظہار انیسویں صدی کے اواخر میں کیا گیا تھا۔ سرحد سے مراد ٹرنر نے کسی مُلک کی سرحد نہیں لی۔ اس کی مراد تھی ایک ایسے علاقے سے جس میں کم آبادی ہو۔ لیکن جس کے پرے قیمتی غیر آباد زمین پڑی ہو۔

اوّل اوّل امریکہ میں برطانوی امریکی نوآبادیوں کی سرحد بحر اوقیانوس کی ساحلی آبادیوں سے فوراً پرے شروع ہو جاتی تھی۔ اینگلو امریکی جیسے جیسے پھیلتے گئے ان کا تصادم فرانسیسیوں سے ہُوا جو کنیڈا پر قبضہ کے دعوےدار تھے۔ اور مسسیپی کی وادی کے بڑے حصّہ کو اپنا بتاتے تھے۔ ان کا مقابلہ ہسپانیوں سے بھی ہُوا۔ جو فلوریڈا اور کیلیفورنیا کے علاوہ جنوب مغرب کے ایک بڑے حصّے کے دعوےدار تھے۔ پیش قدمی کے ہر تدریجی مرحلے پر سُرحدی علاقے کو آباد کرنے کے لئے جو اقدام کرنے پڑتے تھے وُہ ایک سے ہی تھے۔ سب سے پہلے شکاری۔ کھوج کرنے والے۔ گاڑی بان۔ ریڈ انڈین تاجر یا جنگجو۔ زمین کی پیمائش کرنے والے اور کان کن آتے تھے۔

یہ تمام لوگ خطرناک زندگی بسر کرتے تھے۔ جس میں ہمت اور خوش تدبیری کی بے حد ضرورت ہوتی تھی —

ان کے پیچھے پیچھے کسان آتے تھے۔ جو اپنی اور خاندان کی روزی کے کفیل ہونے کی کوشش کرتے اور ساتھ ساتھ ہی مکانات بناتے اور زمین صاف کرتے۔ انہیں کسی غیر سے امداد کی کوئی توقع نہیں ہُوا کرتی تھی۔ بلکہ یہ لوگ اپنی محنت اور دانشمندی کے سہارے جیتے تھے۔ بالاخر دیہات اور شہر بس جاتے۔ دُور مغرب میں سب سے اوّل جو لوگ جاکر آباد ہُوئے وُہ گوالے تھے۔ انہیں پہلے تو ریڈ انڈین سے لڑنا پڑا۔ اور اس کے بعد ان کسانوں سے جو کھُلی چراگاہوں میں جنگلے لگانے لگے تھے۔ اور اُن پر اپنا ادھیکار جتانے لگے تھے۔

ٹرنر نے کہا ہے کہ ”ایسے سرحدی تجربات‘ نے امریکی ذہانت کی خصوصی خوبیاں پیدا کی ہیں۔ یعنی کھُردراپن اور طاقت کے ساتھ ہی فراست اور تحقیق پسندی۔ ایک عملی اختراعی دماغ جو تیزی کے ساتھ مفید چارۂ کار ڈھونڈ نکالے مادی اشیا پر مکمل قابض ہونیکی شکتی جو فنکارانہ تو نہیں۔ لیکن اس قدر طاقتور ضرور ہے کہ اعلیٰ نتائج پیدا کرسکے۔ ایک مضطرب سیال قوتِ عمل۔ ایک خصوصی انفرادیت جو اچھے بُرے افعال میں شدت سے ظاہر ہو۔ اور اس کے ہمراہ وُہ لچک اور اُٹھان جو آزادی کی دین ہے۔ یہ ہیں سرحد کی خصوصیات“۔ ٹرنر نے اسی سرحد کو ہی امریکی جمہوریت اور مساوات کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ ایک امریکی کو غریب رہنے یا سماج میں حقیر بن کر زندگی بسر کرنیکی چنداں ضرورت نہ تھی۔ وُہ جب چاہے سرحد پر جاکر نئی زندگی کی بُنیاد ڈال سکتا تھا ——— جیمز فینی مور کوپر James Fenimore Cooper کے ناولوں سے لیکر موجودہ دَور کے ٹیلی ویژن سلسلوں اور مغربی فلموں تک بہت سے عوامی مقبولیت کے آرٹ میں ابتدائی زندگی کا یا غیر آباد مُلک میں جہاں بے حد مویشی تھے۔ وہاں زندگی کیسے بسر کی جاتی تھی۔ اس کا ڈرامائی انداز میں ذکر ملے گا۔

امریکی اپنے آپ کو پہلے مہم جُو تصور کرتے ہیں۔ جو اپنے اِردگرد کی دُنیا کو لگاتار سُدھارتے اور ترقی دیتے جاتے ہوں۔ لاکھوں تارکانِ وطن کو جو یورپ سے امریکہ میں آباد ہُوئے تھے‘ امریکہ اور سرحدی علاقے شاندار مواقع پیش کر رہے تھے۔ لیکن سرحد سے دوچار ہونے سے قبل بھی ان تارکانِ وطن کی ایک اپنی خاص خُوبی تھی۔

امریکی دماغ کی گہرائیوں تک پہنچنے کیلئے جو حالیہ مطالعے ہُوئے ہیں‘ اُن میں ایک بصیرت افروز کتاب ہسپانوی فلاسفر جارج سین ٹی آنا George Santayana کی ہے جس کا نام ہے۔ امریکہ میں کردار اور رائے عامہ Character and opinion in the United States یہ ۱۹۲۰ء میں شائع ہُوئی تھی۔ اِس کتاب میں جارج سین ٹی آنا نے لکھا ہے۔ کہ ”نئی دُنیا کے معلوم ہونے پر یورپی باشندوں کے سامنے یہاں رہنے یا نئی دُنیا میں جانے کا سوال آکھڑا ہُوا۔ نیگروؤں کے علاوہ تمام نو آبادکار اپنی مرضی سے آئے تھے۔ خوش قسمت لوگ یا وُہ جن کی جڑیں بہت گہری تھیں‘ یا جو کاہل تھے‘ گھر پر ہی رہ گئے تھے۔ لیکن وحشیانہ جذبے یا دوسرے سے بے اطمینانی نے ان آبادکاروں کو افق کے اس پار دیکھنے پر اُکسایا۔ لہٰذا امریکی سب سے زیادہ مہم جُو ہیں۔ یا کم ازکم ان یورپی لوگوں کی اولاد ہیں‘ جو سب سے زیادہ مہم جُو تھے۔ ہر امریکی کیلئے ماضی میں اور خاص طور پر ماضی بعید میں جو کچھ ہُوا ہے‘ وُہ مستند نہیں ہے۔ لیکن جس بات پر اسے بہت جوش آتا ہے وُہ مستقبل ہے۔ لہٰذا ان توقعات نے جسے وُہ پسند کرتا ہے۔ یا اس پسندیدگی پر جس کی وُہ اُمید لگائے ہُوئے تھے۔ اُسے رجائیت پسند بنا دیا ہے۔ اور پُر اُمیدی ایک بادی کے لئے لازمی جزوِ ایمان ہے“۔

پہلے پہل جو امریکی آئے اُنہیں یقین تھا۔ کہ انہوں نے اس کام کو خود چُنا ہے، یا اُن کو اس کام کیلئے خُدا نے چُنا ہے۔ پہلے امریکی پروٹسٹنٹ تارکان وطن پر بائیبل قدیم کا بےحد اثر پڑا تھا۔ وُہ اپنے آپ کو ان یہودیوں سے تشبیہہ دیتے تھے جنہیں Jehovah مصر سے سرزمین موعود کنعان لائے تھے۔ نیو انگلینڈ میں آکر، بسنے والے ایک پادری نے انگلستان کے بارے میں جسے وُہ چھوڑ کر آیا تھا۔ یہ کہا کہ ”خدا نے تمام قوم کو چھان کر ایسے بیج نکال لئے ہیں، جنہیں کہ وُہ اس غیر آباد دُنیا میں بھیج دے۔“

اِس امر کا احساس کہ خدا نے ہمیں چُنا ہے۔ احساسِ مقصد سے آیا۔ نو آبادکاروں نے محسوس کیا کہ یہ ان کی ذمہ داری ہے۔ کہ وُہ نئی دُنیا میں ایک نئی قِسم کی مملکت کی بُنیاد ڈالیں۔ اس مُلک کے دروازے تمام امیر و غریب پر کُھلے تھے۔ نو آبادیاتی دَور میں امریکہ میں آنے والے لوگوں میں کثیر تعداد غالباً ۵۰ فیصد تک ایسے ملازمین کی تھی، جو اقرار نامہ بھر کر آئے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انہیں اس سے قبل کہ وُہ آزاد کئے جائیں۔ اپنے مالکوں کے لئے خاص مدّت تک کام کرنا تھا۔ عام طور پر یہ ملازمین امریکہ آنے کے اخراجات پورا کرنے کے لئے اِس قِسم کے اقرار نامے خود کر لیتے تھے۔ اَور جب ان کے اقرار نامے کی میعاد ختم ہو جاتی تھی، تو وُہ بھی دوسرے شہریوں کے برابر سماجی درجے کے حقدار ہو جاتے تھے۔

امریکہ کی یہی خصوصیت نہیں کہ اس میں جسمانی ادل بدل بہت ہے۔ لوگ ایک مقام سے دوسرے مقام پر بسرعت چلے جاتے ہیں۔ بلکہ سماجی تبدیلیاں بھی اسی تیزی سے آتی ہیں۔ یعنی ایک انسان بسرعت ایک سماجی درجے سے دوسرے سماجی درجے میں چلا جاتا ہے۔ اور یہ حرکت زیادہ تر اُونچے طبقوں کی طرف رہی ہے۔ امریکہ میں آنیوالے لوگوں کی کثیر تعداد اَور خاص طور پر انیسویں صدی کے دوران میں نچلے درجے کے کسانوں اور مزدوروں کی تھی۔

لیکن ریاست ہائے متحدہ امریکہ اقتصادی اَور سماجی لحاظ سے اب ایک ایسا مُلک ہے جس میں درمیانے طبقے کے لوگ بہت زیادہ ہیں۔ لگ بھگ ایک یا دو نسلوں کے بعد نئے آنیوالے تیزی کے ساتھ سماجی اور اقتصادی بلندیاں

شکاگو کی عمارتوں کا منظر۔ پیشِ منظر میں مشی گن بولیوارڈ ہے

طے کرنے لگتے ہیں۔ کبھی کبھار کساد بازاری۔ کاروبار کے فیل ہونے یا دوسری بدنصیبیوں کی بنا پر لوگ نچلے درجہ پر بھی آجاتے ہیں۔ لیکن امریکی نظریۂ حیات میں یہ بات بہت اہم ہے۔ کہ امریکہ مواقع کا دیس ہے۔ جہاں انسان کو ایک نہیں تو دوسرا موقع نصیب ہوتا ہے۔

مغرب کی طرف پیش قدمی ہونے۔ آبادی کے بڑھنے اور مُلک کی وسعت نے امریکی تصور پر گہرا اثر کیا۔ ۱۸۲۰ء اور ۱۸۹۰ء کے درمیانی برسوں میں جِس سرعت کے ساتھ غیر آباد علاقوں میں آبادکاری ہُوئی۔ اس نے حرکت۔ جسمانی پیش رفت اور سماجی ترقی کے خیالات کو امریکی دماغ میں بٹھا دیا۔ "جِس قدر زیادہ بڑا ہوگا۔ اُسی قدر بہتر ہوگا۔" یہ ضرب المثل امریکہ بھر میں زبانِ زدعام ہو گئی۔ بلاشبہ وسعت پر بہت زیادہ زور دیا جانے لگا۔ سنکیلر لی وس Sinclair Lewis نے اپنے ناول 'بابٹ' Babbit میں وسعت سے اِس قدر لگاؤ کے تصور کا مذاق بھی اُڑایا ہے۔ لیکن اگر ہم شہروں کے پھیلاؤ کے اعداد و شمار پر نظر ڈالیں تو ہمیں معلوم ہو جائیگا کہ وسعت پر زور دینا کیوں کر ضروری تھا۔ ۱۸۴۰ء میں شکاگو کی آبادی ۴۵۰۰ سے کم تھی۔ ۱۸۸۰ء میں یہ ۵ لاکھ ہو گئی۔ ۱۰ برس بعد ۱۸۹۰ء میں یہ تعداد دوگنی یعنی ۱۰ لاکھ تھی۔ اوک لاہوما سِٹی۔ اوک لاہوما کی آبادی ۱۹۰۰ء میں ۱۰ ہزار تھی۔ لیکن ۱۹۳۰ء میں ۱۸۵۰۰۰ ہو گئی۔ کولوریڈو کے شہر ڈِنور کی آبادی بیس برس میں بیس گُنا ہُوئی۔

جیسے جیسے ایک علاقے میں نئے آبادکار آتے جاتے تھے۔ قدرتی طور پر زمین کی قیمت بڑھتی جاتی تھی۔ پہلے پہل آباد ہونیوالوں میں سے جو دُوربین اور دانشمند تھے، وُہ زیادہ زمین کی قیمتیں بڑھنے اور تجارت میں وسعت آنے کی بِنا پر مالدار اور صاحب جاہ و حشمت ہو گئے۔ دُور مغرب میں ذہین ترین یا خوش قسمت ترین لوگوں نے مویشیوں اور کانوں سے دولت بنائی۔ بہت عرصہ تک ایسے علاقوں میں جہاں گوالے یا کان کن کُنبوں سے اور منظم قِسم کے اداروں سے الگ تھلگ رہتے تھے۔ نفاست پسندی اور ثقافت غائب رہی۔ بلاشبہ مویشی شہروں اور کانوں کے کیمپوں میں بیسوں برس تک افراتفری رہی لیکن اس حد تک نہیں، جِس کا اظہار امریکہ کی فلموں میں ہوتا ہے۔

جُوں جُوں قوم مغرب کی جانب بڑھی، وُہ ثقافتی طور پر کثیر رنگ ہوتی گئی۔ اس کے کئی ایک وجُوہ تھے —— اولین اوقیانوسی ساحل کے نوآبادکاروں کے مقابلہ میں بعد کے نوآبادکار کئی مُلکوں سے آئے تھے۔ علاوہ ازیں مشرق میں موسم اور جغرافیہ کا اِس قدر تنوع نہیں، جتنا کہ دُور مغرب میں بعد میں آباد کئے جانیوالے علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ قدرتی امر تھا کہ نوآبادکاروں پر اس کا بہت گہرا اثر پڑا۔ مزید برآں فرانس اور سپین سے معاہدوں کی رُو سے، یا جنگ کے ذریعہ جو علاقے لِئے گئے۔ ان میں قدیمی حکمرانوں کی ثقافت کے کئی نشانات باقی رہ گئے۔ بلکہ ابھی تک قائم ہیں۔ جنوب مغرب میں ابھی تک بھاری تعداد میں ایسے لوگ بستے ہیں، جو ہسپانوی زبان بولتے ہیں۔ اور یہ اس دِن سے چلے آرہے ہیں، جبکہ یہاں سپین یا میکسیکو کا قبضہ تھا۔

سیاح ریڈ انڈین پیوبلاس Pueblos ۔ مٹی کے بنے ہُوئے سانجھے ڈیرے۔ دیکھنے جاتے ہیں جن میں لوگ اب بھی رہتے ہیں، اور اس سے قبل بھی رہتے تھے۔ جبکہ کولمبس نے امریکہ کی دریافت کی۔ نیواورلینیس New Orleans کو اِس بات پر فخر ہے۔ کہ وُہ ایک پردیسی شہر ہے، جہاں فرانس اور سپین کے کئی اثرات پائے جاتے ہیں۔

خاص امریکی حرکت پذیری اور تنوع جو سماجی بھی ہے، اور جغرافیائی بھی۔ ان کا بخوبی بیان ابراہیم لنکن کے ابتدائی کردار اور اس کے آباواجداد سے ہو سکتا ہے۔ امریکہ کی خانہ جنگی کے دوران میں ابراہیم لنکن صدر تھے۔

لنکن کے والدین ورجینیا میں پیدا ہوئے اور وہ کینٹکی کی سرحد پر آ گئے جہاں لنکن پیدا ہوا۔ اس کے بعد یہ پہلے انڈیانا گئے اور پھر الی نوئے۔ لنکن ایک عام مزدور تھا جو جنگلے لگانے کیلئے درختوں کو چیرا کرتا تھا۔ پھر کلرک ہوا۔ اور بعدازاں خود سٹور کا مالک بن گیا۔ پیمائش کنندہ بھی بنا۔ اور آخر کار ایک خود ساختہ وکیل بن گیا۔ راستے میں رکاوٹ بننے کی بجائے یہ غریبانہ آغاز لنکن کی شہرت میں اضافہ کا باعث ہوا۔ اس کا لکڑہارے کے گھر سے صدارت تک پہنچنا امریکہ میں عوام کو کس قدر مواقع حاصل ہیں، اُن کی ایک مثال بن گیا۔ جن کے اتحاد نے اس قسم کے موقع کو ممکن بنایا۔ ان میں محل وقوع۔ اقتصادیات اور آزادانہ ترکِ وطن کے علاوہ وہ سیاسی اور مذہبی ادارے بھی ہیں جو اول اول تو انگلستان سے آنے والے مہاجرین لائے۔ اور کسی قدر کم مغربی یورپ سے آنے والے بعد کے نوآبادکار لائے۔

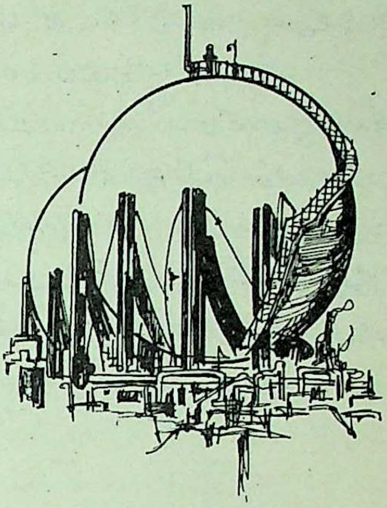

امریکی کردار اور معیشت

اگر امریکی کردار کی نشو ونما میں جغرافیائی حالات نے اِس قدر گہرا حصّہ لیا ہے۔ تو دوسری جانب طرزِ معیشت کا بھی کچھ کم ہاتھ نہیں رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں کو بمشکل جُدا کیا جا سکتا ہے۔

امریکہ میں اوّلیں آبادکاری نجی ہمت کی مرہونِ منت ہے۔ سترھویں صدی کے ابتدا میں انگلستان شمالی امریکہ کو زیادہ تر خام مال اور دولت کا سرچشمہ سمجھتا تھا۔ شاہی حکومت نے مالدار تاجروں کو سٹاک کمپنیاں بنانے کیلئے مدد دی اور انہیں اجازت دی کہ وُہ نئے براعظم کے خاص خاص حصّوں میں آبادکاری کریں اور تجارت کو فروغ دیں۔ اور جب یہ کمپنیاں کامیاب نہ ہُوئیں تو امریکہ کے وسیع رقبوں کے حقوق مالکانہ ایسے افراد یا گروہوں کو دیئے گئے جو عام طور پر مذہبی وجُوہ کی بِنا پر شمالی امریکہ کے براعظم کے خطّوں میں آبادکاری پر رضامند تھے۔

ان نوآبادکاروں کو تاجِ برطانیہ محض حُکم نامے دیتا تھا۔ لیکن جہازوں۔ خوراک اور روپے پیسے کا انتظام انہیں خود ہی کرنا پڑتا تھا۔ نیو انگلینڈ کی نوآبادیوں کی تعمیر ایسی خود مختار کمپنیوں نے کی جس کے ہر ممبر کو ووٹ دینے کا ادھیکار تھا۔ یہ کمپنیاں باقاعدگی کے ساتھ اجتماع کیا کرتیں۔ اور اُن کے افسران کا سالانہ چُناؤ ہوتا تھا۔ انہی باتوں نے امریکہ میں جمہوری حکومت کی بُنیاد رکھدی۔ وسطی اوقیانوس کی نوآبادیاں اور جنوبی نوآبادیاں ولیم پن ایسے کوئیکر اور رومن کیتھولک مذہب سے تعلق رکھنے والے لارڈ بالٹی مور ایسے انفرادی مالکان زمین نے ہی تعمیر کیں۔

ابتدا میں اگرچہ ان مالکان کو وسیع اختیارات حاصل تھے۔ تاہم انہیں جلد ہی نمائندہ اسمبلیوں اور منتخب شُدہ کونسلروں کو اپنے اختیارات میں برابر کا شریک بنانا پڑا۔

لکڑی فر۔ لوہا اور دوسری ایسی اشیا جنکی یورپ کو ضرورت تھی امریکہ میں با فراط ملتی تھیں لیکن جس چیز کی کمی تھی، وُہ تھے مزدُور۔ نوآبادیوں کے مالکان نے ایسے اشخاص کی جستجو شروع کر دی جو مہم جُو ہوں اور سمندروں کے جان جوکھوں سفر کو برداشت کر سکیں اور نئی دُنیا میں زندگی بسر کرنیکی مُشکلات سہنے پر رضامند ہوں۔ مثال کے طور پر پنسلوانیا کی نوآبادی نے جرمنی بھر میں اپنے ایجنٹ رکھ چھوڑے تھے، تاکہ وُہ نئے رضاکاروں کی بھرتی کر کے اُنہیں امریکہ بھیجنے کا انتظام کریں۔

یورپ کے بیشتر حِصّوں میں آبادی زیادہ ہو گئی تھی جبکہ زراعت کیلئے زمین میسر نہیں آ رہی تھی۔ دوسری جانب امریکہ میں اِتنے لوگ ہی نہ تھے کہ وُہ قدرتی وسائل کے نہ ختم ہونیوالے سِلسلہ سے فائدہ اُٹھا سکیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ ابتدا ہی سے امریکہ میں جسمانی محنت کرنیوالوں کو قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا گیا ہے۔ یہ امریکی روایت کا ایک حِصّہ تھا۔ کہ وہاں کامیاب انسان وہی ہے، جو اپنی ہمت سے آگے بڑھا ہو، جس نے جوانی میں ترقی کے زینے پر چڑھنا شروع کیا اور اس مقصد کیلئے اُسے مختلف کام کرنے پڑے جن میں جسمانی محنت بھی تھی۔ اگرچہ گذشتہ صدی کی نسبت ایسے آغاز اب کم ہو گئے ہیں، لیکن جن انسانوں نے اِس طرح ترقی کی، وُہ اس پر فخر کرتے ہیں۔

اوّلیں آبادکاروں میں دولت اور جائیداد کا فرق بہت جلد اور تیزی کے ساتھ پیدا ہو گیا لیکن اس کی وجہ وراثت سے زیادہ اپنی ذاتی محنت اور جرأتِ عمل تھی۔

بنجمن فرینکلن نے اپنے کتابچہ امریکہ جانے والوں کیلئے اطلاعات (مجریہ ۱۸۷۲ء) میں یہ کہا تھا کہ وہاں پر اُس کو کوئی نہیں پوچھتا کہ تم کس خاندان میں پیدا ہُوئے ہو۔ وہاں "اجنبی سے یہ نہیں پوچھا جاتا کہ آپ کون ہیں۔ بلکہ لوگ یہ پوچھتے ہیں کہ آپ کیا کر سکتے ہیں۔"

وُہ زمیندارانہ مراعات اور حد بندیاں جنہوں نے اگلی دو صدی تک یورپ کو اقتصادی طور پر ترقی نہ کرنے دی، نئی دُنیا میں کوئی جڑ نہ پکڑ سکیں۔ یورپ سے پیشہ وارانہ جماعتی نظام امریکہ میں درآمد نہیں کیا گیا تھا۔ امریکی کارکُن قیمتوں کے تعیّن اور اُجرتوں کے قواعد کو نہایت آسانی کے ساتھ ناکام بنا سکتے تھے کیونکہ وہ بہ آسانی ایک کام کو چھوڑ کر دوسرا کام کر سکتے تھے۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ جا سکتے تھے۔ بلکہ ایک نوآبادی سے دوسری آبادی میں منتقل ہو سکتے تھے۔

۱۷ویں صدی کے اواخر اور ۱۸ویں صدی کے اوائل میں تاجِ برطانیہ نے نوآبادیوں پر بتدریج اپنا اختیار بڑھا لیا اور اپنے گورنروں کے ذریعہ حکومت کرنا شروع کر دی۔ انگلستان امریکہ سے مچھلی، لکڑی اور تمباکو درآمد کیا کرتا تھا اور جہاز سازی کی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔ اگرچہ نیوانگلینڈ کے بحری کپتان افریقہ اور ویسٹ انڈیز بلکہ انگلستان تک سفر کر آتے تھے لیکن امریکی غیر ملکی تجارت کی پوری دیکھ بھال ہوتی تھی۔ مقامی طور پر چیزوں کے بنانے کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا بلکہ بعض اوقات حکماً بند کر دیا جاتا تھا۔ امریکہ کو زیادہ تر اشیا انگلستان سے منگوانا پڑتی تھیں۔ اقتصادی نقطہ نظر سے تاجِ برطانیہ کی اکثر پالیسیاں انگلستان کیلئے مفید ہوتی تھیں لیکن اُن کو ایک ایسی پارلیمنٹ منظور کرتی تھی جِس میں نوآبادکاروں کا کوئی نمائندہ نہیں ہوتا تھا۔ امریکی تاجروں اور سرحدی کاشتکاروں نے ان احکام کے خلاف دلیرانہ طریقے سے احتجاج کیا، اور جب ان قوانین سے انہیں اپنا نقصان ہوتا دکھائی دیا تو انکی پرواہ تک نہ کی۔

آزاد تجارت کے حق میں جو نوآبادکار تھے، اُن میں بنجمن فرینکلن (۱۷۰۶-۱۷۹۰) کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اُنکی زندگی پر اِس لئے بھی نظر ڈالنی چاہیئے کہ وُہ خود ساختہ انسانوں میں سے ہے جو امریکہ کی ایک خاص روایت ہے۔

فرینکلن ایک شمع ساز کا لڑکا تھا اور اُس نے گھر پر ہی تعلیم حاصل کی تھی۔ ابتدا میں وُہ ایک چھاپے خانہ میں کام سیکھنے لگا۔ جب وُہ سترہ برس کا ہُوا تو عوامی گیتوں کے کرداروں کی طرح وُہ اپنے گھر بوسٹن سے بھاگ کھڑا ہُوا۔ اور قسمت آزمانے کیلئے فلاڈلفیا

آ گیا۔ ۱۹ برس کی عمر میں وہ انگلستان سے ایک نئی چھاپے کی دکان کیلئے ٹائپ خریدنے کی غرض سے گیا۔ اس قیام کے دوران میں اس نے "آزادی، ضرورت، مسرت اور دکھ پر ایک بحث" نے ایک کتابچہ شائع کیا جس نے انگلستان کے چند سرکردہ فلاسفروں کو اس کی جانب متوجہ کر دیا۔ ۲۰ برس کی عمر میں وہ واپس فلاڈلفیا چلا آیا اور یہاں وہ مختلف شہری کاموں میں مصروف ہو گیا۔ اپنی باقی ماندہ زندگی میں جو خاصی طویل تھی، اس نے کتنے ہی کاموں کو سرانجام دیا۔ اس میں اس کا وہ تجربہ بھی شامل ہے، جو اس نے ایک پتنگ اڑا کر یہ ثابت کرنے کیلئے کیا تھا کہ آسمان میں چمکنے والی برق دراصل بجلی ہے۔

فرینکلن نے اپنی خود ساختہ ترقی کا ذکر اپنی سوانح حیات میں کیا ہے، جو ایک مقبولِ عام تصنیف ہے۔ اس نے اپنے قارئین کو بتایا ہے کہ "صبح پانچ بجے یا رات کے نو بجے اگر آپ کے ہاں سے ہتھوڑے کی آواز آئے تو اسے سنکر آپکا قرضخواہ اگلے چھ ماہ تک سکھ کی نیند سوئے گا۔ اس کے مشہور مقولوں میں سے کچھ یہ ہیں: "خدا اُن کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد کرتے ہیں"۔ "جو پیسہ بچاؤ گے سمجھو کہ وہ تم نے پیدا کیا ہے"۔ "وقت خود دولت ہے"۔ "جو لوگ جلد سوتے ہیں اور جلد اٹھتے ہیں وہ صحتور، دولت مند اور عقلمند ہو جاتے ہیں"۔

لیکن ان مقولوں سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ فرینکلن کوئی تنگ نظر، خود پسند قسم کی ذہنیت کا انسان تھا۔ اس نے پبلک لائبریریاں قائم کیں اور امریکن فلاسفیکل سوسائٹی کی بنیاد ڈالی۔ اس نے پانچ زبانیں سیکھیں اور یورپ کے کئی علمی اداروں نے اس کی سائنسی تحریروں سے متاثر ہو کر اسے اپنا ممبر بنا لیا۔ فرانس میں جب وہ امریکہ کے سفیر کی حیثیت سے گیا، تو وہاں وہ ایک پُرمذاق انسان کے طور پر ہی مقبول نہیں ہوا بلکہ سیاست اور اقتصادیات کے گہرے مسائل کو سمجھنے پر اس کی تعریف کی گئی۔

فرینکلن لوگوں کو اگرچہ صحت مند اور دولتمند چاہتا تھا لیکن وہ انہیں عقلمند دیکھنا بھی چاہتا تھا۔ اس کیلئے دولت یا طاقت کوئی مطمعِ نظر نہ تھی۔ اس نے لکھا ہے: "محنت کرو اور آزاد رہو۔ کفایت شعاری کرو اور آزاد رہو"۔ اس نے عظیم امریکیوں کیطرح اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو عوامی ترقی، خدمت اور بہبود کے کاموں میں لگایا۔ اپنی طویل عمر کے آخری دنوں میں وہ "دھواں دینے والی چمنیوں کے وجوہ اور روک تھام" پر ہی مضامین نہیں لکھ رہا تھا بلکہ اسکے ساتھ ساتھ وہ انسدادِ غلامی کی سوسائٹی کے صدر کے فرائض بھی بخوبی سرانجام دے رہا تھا۔

سنہ ۱۷۷۶-۱۷۸۳ء کی انقلابی جنگ جس کا ایک روحِ رواں خود فرینکلن تھا، اس بنا پر ہوئی کہ برطانیہ نے ٹیکس بڑھا دیئے تھے۔ امریکی تجارت، چیزوں کی ساخت اور اندرونِ ملک میں ان کی نقل و حرکت پر پابندیاں لگا دی تھیں۔ علاوہ ازیں یہ انقلاب ایک ایسی طرزِ زندگی کی مدافعت کیلئے تھا جس میں دولت کی مساوات اور موقعوں کی یکسانیت اس وقت کے یورپ سے کہیں زیادہ تھی۔

آزادی کے بعد جو سرمایہ لگایا گیا، اس کا بیشتر حصہ تجارت اور آمد و رفت کے وسائل کی ترقی میں لگا، جس میں اوّل تو جہازوں کی ساخت تھی پھر نہروں کی کھدائی اور اس کے بعد ریلوے کی تعمیر۔ امریکہ کا ایک تیز رفتار بحری بیڑہ جلد ہی دنیا کے کونے کونے میں پہنچنے لگا۔ اور ان سب باتوں نے مل کر امریکی نقل و حرکت کو تیز تر کر دیا۔

انیسویں صدی بھر میں ایک طرف کسانوں اور شہری مزدوروں میں، دوسری طرف تاجروں، بینکروں اور صنعت کاروں میں خاصی سیاسی چپقلش رہی۔ کاشتکار تعداد میں زیادہ تھے، وہ کم سے کم حکومت کے خواہاں تھے لیکن صنعت کار چاہتے تھے کہ ایک طاقتور مرکزی سرکار ہو، جو تجارت کی حفاظت کرے اور اس کو بڑھاوا دے، کرنسی کی قیمت کو اونچے معیار پر رکھے، اندرونِ ملک ترقی کے کاموں میں روپیہ پیسہ سے امداد دے اور سرکاری زمین کو فروخت کر کے سرکاری خزانے کو بھرے۔ ہمیشہ تو نہ سہی لیکن اکثر ایسا ہوا ہے کہ شہروں کے مزدوروں اور چھوٹے تاجروں نے کاشتکاروں کا ساتھ دیا۔ مغربی علاقوں کے کاشتکار اور مشرقی جانب کے کاشتکار بننے والے لوگ یہ چاہتے تھے کہ سرکار نوآبادکاروں کو مفت زمین دے۔ طبقاتی مفادات بھی ایک عنصر تھا، اور ایسے کھیت جن میں غلام کام کرتے تھے بڑھ رہے تھے، انہوں نے ملکر حالات کو پیچیدہ کر دیا۔

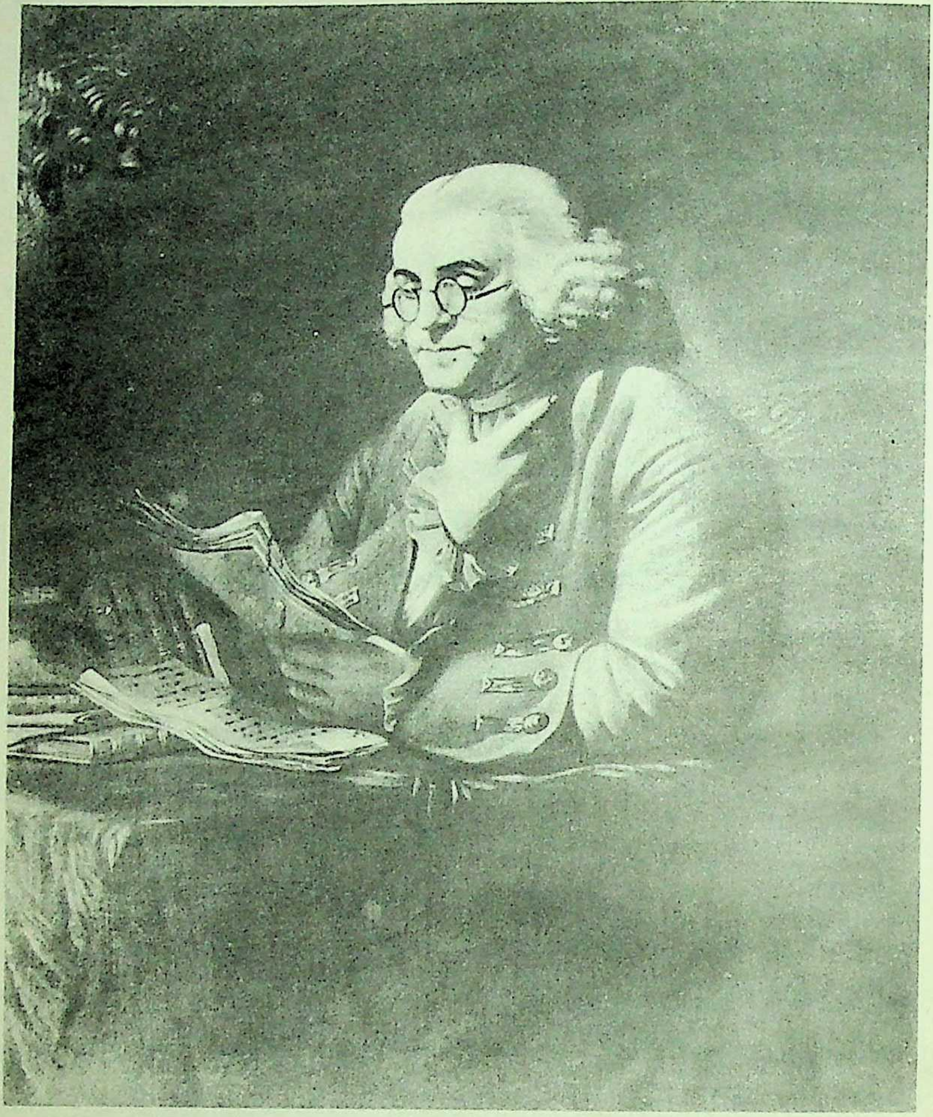

بنجمن فرینکلن —— مدبر، مُوجد اور فلسفی

مثال کے طور پر خانہ جنگی سے قبل مغرب کے کاشتکاروں نے جن میں بہت سے حال ہی میں جرمنی سے آئے تھے۔ جنوب اور اُسکے رواج غلامی کی مخالفت کی۔ جبکہ نیویارک کے کارکنوں نے جن میں سے اکثر آئرلینڈ سے آنیوالے حالیہ مہاجرین تھے۔ جنوب کی حمایت کی۔ یاکم ازکم وُہ جنگ نہیں چاہتے تھے۔

اِس قدر زیادہ زمین کے میسر آنے اَور اس قدر قدرتی وسائل کے موجُود ہونیکی بنا پر آزاد کسانوں اور صنعتی ترقی کیلئے کافی مواقع تھے۔ انیسویں صدی میں دونوں میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کو مغلوب نہ کر پایا۔ اگرچہ خانہ جنگی نے (۱۸۶۱-۱۸۶۵)

صنعتی ترقی کی رفتار کو تیز کر دیا۔

خانہ جنگی کے بعد کی دہائیوں میں صنعتیں تیزی کے ساتھ پھیلیں۔ اور اگرچہ اس تباہ کن تصادم کی کئی ایک وجوہات تھیں (بعض اوقات اِس جنگ کو دوسرے امریکی انقلاب کا نام دیا جاتا ہے) لیکن اس کی اہم وجہ شمال اور جنوب کی معیشت میں فرق تھا۔ جنوب میں سماجی ڈھانچہ خاص طور پر بڑے بڑے فارموں پر زمیندارانہ ہی تھا۔ اور یہ فارم بھی خود کفیل نہ تھے۔ ان پر ایک ہی فصل اُگلتی تھی۔ یعنی کپاس جسے باہر بھیجا جاتا تھا۔ اس کی پیداوار پر بہت خرچ اُٹھتا تھا۔ اور مالکان مقروض ہی رہتے تھے۔ جنوب کے یونین سے الگ ہونیکے بعد جو خانہ جنگی شروع ہُوئی۔ اس میں اقتصادی برتری شمال کے ہاتھ میں رہی۔

خانہ جنگی کے بعد مرکزی سرکار نے ریلوے بنانے والوں کو ۱۰ کروڑ ایکڑ زمین سے بھی زیادہ سرکاری علاقہ امداد کے طور پر دیا۔ ۱۸۶۹ء تک براعظم کے دونوں سروں تک جانیوالی ریلوے تعمیر ہو گئی تھی اور دوسری لائینیں بھی تیزی کے ساتھ بننے لگیں اور یہ مُلک کے سارے علاقوں میں پہنچ گئیں۔ بھاری تعداد میں مہاجرین امریکہ میں آنے لگے۔ اور فیکٹریوں۔ کانوں اور فارموں میں مزدوروں کا کام کرنے لگے۔ نئی نئی ایجادیں تیزی سے امریکی زندگی کا رنگ ڈھنگ بدل رہی تھیں۔ ان کے بنانے والوں کو زیادہ مقدار میں سرمایہ ملنے لگا۔

اس تیز اقتصادی پھیلاؤ سے جس پر حکومت کا کوئی کنٹرول نہ تھا۔ نئے قسم کے انسان کو جو کہ پچھلے دَور کے طاقتور انسان سے قطعی طور پر مختلف تھا۔ اقتدار کے نئے موقعے ہاتھ آ گئے۔ اِس دَور کے خود ساختہ انسانوں میں انڈریو کارنیگی کی مثال خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

انڈریو کارنیگی Andrew Carnegie ۱۹۱۰ - ۱۹۳۵ سکاٹ لینڈ میں پیدا ہُوا۔ اور اپنے باپ کے ہمراہ پن سل وانیہ کی کپاس کی فیکٹری میں کام کرنے کیلئے آیا۔ اس وقت اسکی عمر ۱۳ برس تھی۔ کچھ عرصہ تک وُہ ٹیلی گراف آپریٹر رہا اور اس کے بعد وُہ تیزی سے ترقی کرتا ہُوا ریلوے کا ملازم ہو گیا۔ ۲۴ برس کی عمر میں وُہ ایک ریلوے ڈویژن کا سپرنٹنڈنٹ تھا۔ اور سونے والی گاڑیوں کو مقبول بنانے میں مصروف تھا۔ ان گاڑیوں سے اُسے جو نفع حاصل ہُوا وُہ اُس نے مختلف کاروبار میں مزید نفع حاصل کرنے کیلئے لگا دیا۔ یہاں تک کہ اُس نے لوہے کی کانوں اور تیل کے چشموں میں بھی سرمایہ لگایا۔ خانہ جنگی کے دِنوں میں اُس نے فوج کو ٹیلی گراف اور ریلوے کی سہولیات بہم پہنچانے کا کام کیا۔

۲۸ برس کو پہنچتے پہنچتے کارنیگی کی کل آمدن اپنی ریلوے کی ملازمت کی تنخواہ سے ۲۰ گُنا تھی۔ جنگ کے بعد اُس نے لوہے کی فیکٹریاں خریدنا، انہیں پھیلانا اور منظم کرنا شروع کر دیا۔ اِس کے بعد اُس نے فولاد کی فیکٹریوں کو چلایا۔ اس نے ایسے پُلوں اور ریلوے لائنوں پر سرمایہ لگانا شروع کر دیا۔ جو اُس کی فیکٹریوں کی بنائی ہُوئی چیزوں کو استعمال کرتی ہوں۔ اِس کے بعد اُس نے دھات بردار جہاز خرید لیے۔ گودیاں خرید لیں۔ اور یہاں تک کہ گودام بھی حاصل کر لئے۔ اِس طریقہ سے وُہ دھات نکالنے کے عمل سے لیکر اس کے تعمیر کے کاموں میں استعمال کرنے تک کے تمام وسائل پر قابض ہو گیا۔

انیسویں صدی کے ختم ہونے تک کارنیگی کی سالانہ آمدن ایک کروڑ ڈالر کے قریب تھی اور جب ۱۹۰۱ء میں اُس نے نو تشکیل یافتہ یونائیٹڈ سٹیٹس سٹیل کارپوریشن کے ہاتھ کارنیگی کمپنی کے اپنے حِصّے بیچے تو اُسے ۲۲½ کروڑ ڈالر معاوضہ مِلا تھا۔

اپنی کئی پبلک تقریروں اور لگ بھگ ۱۰ شائع شُدہ کتابوں میں کارنیگی نے ان حالات کی شدید حمایت کی ہے، جن کی موجودگی میں وہ اس قدر دولت پیدا کر پایا۔ لیکن اُس نے اس کو اس وقت حق بجانب قرار دیا ہے جبکہ سرمایہ دار اپنی "فاضل

دولت کو مقدس امانت خیال کرتے ہوئے عوام کی بہبود میں خرچ کرنے" کے اصول کو اپناتا ہے۔ کارنیگی نے اپنی زندگی کے آخری دن اسی اصول پر عمل کرتے ہوئے گزارے۔ جہاں کسی شہر میں لوگوں نے کچھ چندہ دے دیا۔ کارنیگی نے باقی ماندہ رقم اپنی گرہ سے دیکر پبلک لائبریریاں بنا دیں۔ اس طرح اس نے تقریباً ۲۵۰۰ لائبریریاں قائم کیں۔ اس نے پیٹسبرگ میں ٹیکنالوجی کی کارنیگی انسٹی ٹیوٹ بنائی۔ حیاتی اور طبیعاتی سائنسوں کی تعلیم کے لئے واشنگٹن میں ایک اور کارنیگی انسٹی ٹیوٹ بنائی۔ نیگروؤں کی تعلیم کے لئے اس نے ٹسکے جی انسٹی ٹیوٹ بنائی۔ مدرسوں کی اعلیٰ تعلیم کی ترقی کے لئے اس نے کارنیگی فاؤنڈیشن قائم کیا اور بین الاقوامی امن کی خاطر بھی اس نے ایک فنڈ قائم کیا۔

کارنیگی اور دوسرے مالدار افراد نے کارِ خیر کے فاؤنڈیشن قائم کئے ہیں جو اچھے اچھے کاموں کیلئے بہت روپیہ دیتے رہتے ہیں۔ ان فاؤنڈیشنوں کی بنیادی پالیسیاں بھلے ہی مخیّر لوگ خود طے کرتے ہوں لیکن فاؤنڈیشن کے بورڈ آف ڈائرکٹروں میں عام طور پر معلّم، سائنسدان اور رفاہِ عام میں دلچسپی لینے والے تاجر ہوتے ہیں اور انہیں فاؤنڈیشن کا روپیہ خرچ کرنے کی کافی آزادی ہوتی ہے اور وہ اپنے طور پر اس کیلئے قدم اٹھا سکتے ہیں۔ یہ فاؤنڈیشن ایسی ثقافتی اور کارِ خیر کی سرگرمیوں کی امداد کرتے ہیں، جن کو کسی بنا پر سرکاری امداد نہیں ملتی اور تاجر یا دوسرے ادارے بھی مدد نہیں پہنچا سکتے۔ یہ فاؤنڈیشن ادیبوں، فنکاروں اور علماء کو فراخدلانہ طور پر وظائف دیتے ہیں اور ان وظیفہ خواروں پر جبکہ وہ اپنے کام میں مصروف ہوں، کوئی پابندی بھی عائد نہیں کرتے۔

امریکہ کے تمام لکھ پتیوں نے انیسویں صدی کے اواخر میں کارنیگی کی مثال پر عمل نہیں کیا۔ اُن میں سے اکثر نے اپنی دولت کو فضول خرچ کیا اور بقول ایک ماہرِ معیشت تھورسٹین ویبلن یہ خرچ نہایت طمطراق سے کیا گیا۔ ان کے وسیع مکانوں میں یورپ کی قیمتی تصویریں اور فرنیچر کے انبار پڑے ہوتے تھے جبکہ مہاجرین کی بستیوں میں لوگوں کی بے پناہ بھیڑ ہوتی تھی۔ ۱۸۹۰ اور ۱۹۰۰ء کے درمیان شدید قسم کی کساد بازاری اور مزدوروں کی کئی ایک ہڑتالوں سے یہ بات ظاہر ہو گئی کہ فرینکلن اور جیفرسن نے امریکہ کی جس خوش آہنگ مساوات کی تعریف کی تھی، اس سے امریکہ کتنا دُور جا چکا ہے۔

۱۸۹۰ اور ۱۹۰۰ کے درمیان اور بیسویں صدی کے آغاز میں سیاسی جماعتیں، لیبر یونینیں اور عوامی اخبار سبھی اقتصادی اصلاح کا مطالبہ کر رہے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سرکار نے کچھ اقدام کئے۔ جن سے ایک بار پھر اقتصادی مساوات لوٹ آئی۔ ان اقدام میں کارپوریشنوں کے خلاف قوانین تھے، جن کے ذریعہ انہیں تمام صنعتوں کو اپنے قبضہ میں لینے سے روک دیا گیا۔ کچھ ایسے قوانین بنائے گئے جن کے تحت خوراک اور دوائیوں میں ملاوٹ کرنا جرم قرار پایا۔ چند ایک قوانین کے تحت کام کے اوقات کی حد مقرر کر دی گئی۔ سب سے اہم انکم ٹیکس کا ترقی یافتہ قانون تھا۔ اپنی بھاری بھرکم آمدن پر کارنیگی نے کوئی انکم ٹیکس نہیں دیا تھا! لیکن پہلی جنگِ عظیم کے دوران سر ٹیکس ۶۵ فیصدی تک پہنچ گیا اور دوسری جنگِ عظیم کے بعد تو یہ ۹۰ فیصدی تک چلا جاتا تھا۔ وراثت کے ٹیکس بھی بتدریج زیادہ ہوتے جاتے ہیں۔ ٹیکسوں کے قوانین سختی سے نافذ کئے جاتے ہیں۔ لہٰذا اب کسی بھی خاندان کیلئے یہ مشکل ہو گیا ہے، کہ

وُہ بھاری دولت جمع رکھ سکے۔ لہٰذا کئی ایک مشہور لکھ پتیوں کے مکانات میں اب سکول کھُلے ہُوئے ہیں۔ یا وُہ کسی مذہبی فرقہ کے ہاتھ میں ہیں۔

بیسویں صدی کے اوائل میں موٹریں بنانیوالے ہنری فورڈ نے اقتصادی مساوات قائم کرنے میں خاصہ کردار ادا کیا ہے۔ وُہ ۱۸۶۳ء میں پیدا ہُوا۔ اور ڈیٹرائٹ کے قریب ایک فارم میں پرورش پائی۔ اسے مشینری سے اُنس تھا۔ اور اس کی یہ تمنا تھی کہ کھیتوں میں انسانوں کی جگہ مشینری سے کام لیا جانے لگے۔ سنہ ۱۸۹۳ء میں اُس نے ایک گاڑی بنائی۔ جس میں گھوڑا جوتنے کی ضرورت نہ تھی۔ سنہ ۱۹۰۳ء میں جب اُس نے آٹو موبائیل بنانیکا کارخانہ لگایا تو گاڑیاں بنانا ایک پیچیدہ اور مہنگا کام تھا۔ نیز گاڑیاں قابلِ اعتبار نہ تھیں۔ فورڈ کی یہ خواہش تھی کہ وُہ بھاری تعداد میں ایسی کم خرچ آسانی سے مرمت ہونیوالی اور قابلِ اعتبار گاڑیاں بنائے جنہیں کسان اپنے دور افتادہ کھیتوں سے شہروں میں جانے کیلئے استعمال کر سکیں۔ فورڈ نے ایک ہی ماڈل پر توجہ مرکوز کی۔ اس کو بنانے پر جو خرچ اُٹھتا تھا، اُس کو کم کیا۔ اور قیمت فروخت میں بتدریج کمی کرتا گیا۔ اِس طرح وہ زیادہ تعداد میں گاڑیاں بیچنے لگا۔ ۱۹۱۴ء میں اُس نے تقریباً ۲۵۰۰۰۰ موٹر کاریں بنائیں اور ۱۹۲۱ء میں تقریباً ۱۲۵۰۰۰۰۔

فورڈ موٹر کمپنی جو پہلے پہل فورڈ کنبے کے ہاتھ میں تھی۔ اب نیویارک سٹاک ایکسچینج پر اپنے حِصے فروخت کرتی ہے۔ اور اب یہ ایک ایسی کارپوریشن ہے، جِس کے مالک اس کے حِصّہ دار ہیں۔ امریکہ کی معاشی زندگی میں جنرل موٹرز۔ نیو جرسی کی سٹینڈرڈ آئل کمپنی اور امریکن ٹیلی فون اور ٹیلیگراف کمپنی بہت اہم پارٹ ادا کرتی ہیں۔ لیکن یہ ایسے ادارے ہیں، جن کے

امریکہ کی ہوائی ٹرین جِس میں مسافروں کے آرام کی بہت سی چیزیں مہیا کی گئی ہیں

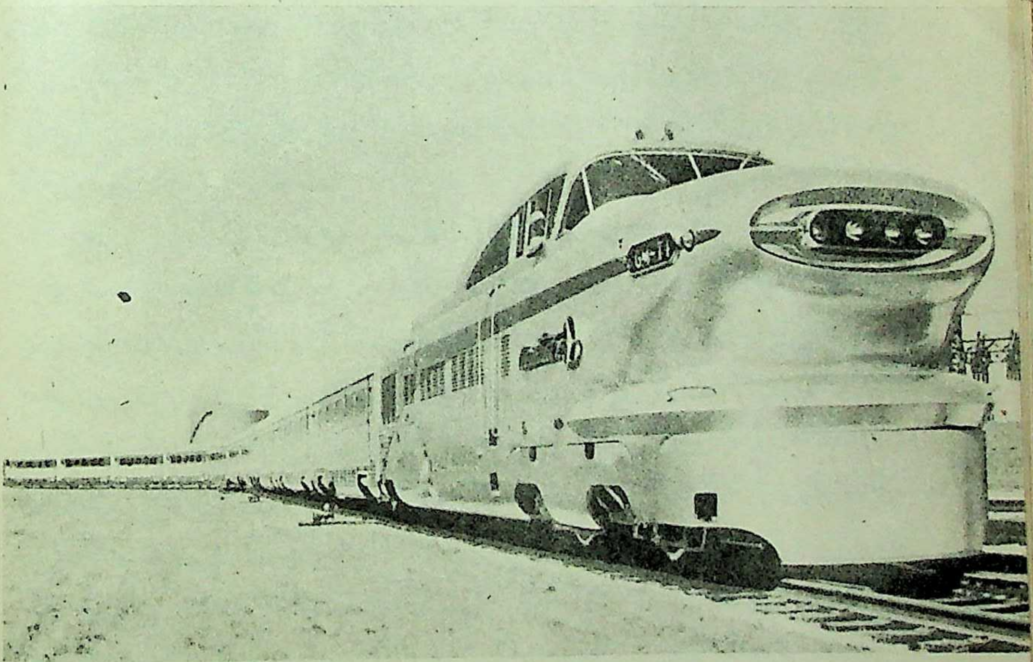

مالک اُن کے ہزاروں حِصّہ دار ہیں اور اُن کا انتظام بھی انفرادی مالکان کی بجائے ماہر منتظمین کے گروہوں کے ہاتھ میں ہے۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ کارنیگی جیسے لوگ اپنے آپ ہی جو چاہیں فیصلہ کر دیں اَور اِس طرح تمام صنعت کا ڈھانچہ ہلا کر رکھدیں۔

امریکہ کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ بیسویں صدی میں جو مالی انقلاب رونما ہوتا رہا ہے۔ اُسکی رہنمائی موٹریں بنانے والوں نے کی۔ امریکی ہمیشہ متحرک رہے ہیں۔ پُرانی دُنیا سے نئی دُنیا کی طرف اور برّاعظم میں مشرق سے مغرب کی جانب۔ اَور اب تو امریکی اَور بھی متحرک ہو گئے ہیں۔ سنہ ۱۹۵۷ء میں امریکہ کے ہر پانچ شہریوں سے پاس دو موٹریں تھیں۔ فیکٹریاں آبادی سے کچھ فاصلے پر واقع ہوا کرتی تھیں۔ اور یہ ایک طے شُدہ امر تھا۔ کہ کارکُن اپنی موٹر کاروں یا اپنے دوستوں کی موٹر کاروں میں کام پر آئیں جائیں گے۔ موٹر کاروں کی اس افراط نے اچھی سڑکوں۔ سڑکوں کے کنارے ریسٹورنٹوں اَور خصتوں پر جانے کیلئے بہتر سہولتوں کی ضرورت بڑھادی ہے۔ مُلک کی سماجی اور مالی زندگی پر ان باتوں کا بالواسطہ اَور بلاواسطہ بھی اثر پڑا ہے۔

اشتہار بازی اَور اخبارات۔ رسائل۔ ریڈیو۔ ٹیلی ویژن قسم کے ذرائع نے جن میں اشتہارات دئیے جاسکتے ہیں۔ ہر قسم کی اشیا کی مانگ بڑھادی ہے۔ اور ان کیلئے پسندیدگی کا میدان تیار کر دیا ہے۔ خریداروں کو نئے اور بہتر ماڈل خریدنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ چاہے وُہ یہ چیزیں اقساط پر خریدیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عام طور پر یہ تصور کیا جاتا ہے کہ موٹر کاریں۔ بجلی کا سامان اور فرنیچر وغیرہ تو زیادہ تر قسطوں کے ذریعہ ہی خریدا جائے گا۔

۱۹۳۰-۴۰ء میں جو کساد بازاری آئی۔ اُس نے امریکہ کی معاشی ترقی میں خلل ڈال دیا تھا۔ لیکن اس کساد بازاری کو دُور کرنے کیلئے جو قدم اُٹھائے گئے۔ اس سے امریکہ کی جمہوری معیشت کو مزید فائدہ رہا۔ حکومت کو اقتصادی امور میں پہلے سے زیادہ دخل انداز ہونا پڑا۔ کساد بازاری کی کچھ وجوہات یہ بھی تھیں کہ بہت زیادہ قرض لیکر تجارت کی جارہی تھی۔ اور حِصّوں کی خرید و فروخت میں بہت بھاری سٹّہ کیا جاتا تھا۔ لہٰذا سٹّہ بازی اور قرض پر کنٹرول کرنے کے لئے نئے قوانین بنائے گئے۔

فرینکلن ڈی روزویلٹ کی نیو ڈیل New Deal اور ہیری ایس ٹرومین (۱۹۴۲-۱۹۵۲) کی فیر ڈیل Fair Deal کے تحت سرکار نے اپنے کاموں کو وسعت دی۔ تاکہ وُہ کساد بازاری کے دنوں میں عوام کی قوتِ خرید کو بڑھا سکے۔ حکومت نے فارم پر پیدا ہونیوالی اشیا کی قیمتوں میں مدد دے کر اور کھیتوں کی وسعت پر کنٹرول کر کے کاشتکاروں کو مناسب آمدن کا یقین دِلا دیا۔

اس کے اور اس کے بعد آنیوالی حکومتوں کے تحت سماجی تحفظ کا ایک وسیع منصوبہ زیرِ عمل لایا گیا۔ جِس سے تمام امریکیوں کو خواہ وُہ اپنا کاروبار کرتے ہوں یا دوسروں کے ہاں ملازم ہوں فائدہ پہنچانا مقصود تھا۔ اس منصوبے کے ذریعہ بے کاروں کو معاوضہ دینے۔ ملازمت سے ریٹائر ہونے کی صُورت میں پنشن مقرر کرنے اَور دوسری مراعات کا تعیّن تھا۔ علاوہ ازیں کم سے کم اُجرت دینے کے قومی قوانین بھی منصوبے میں شامل کئے گئے ہیں۔

ٹی۔ وی۔ اے کے معاملہ پر اکثر اوقات ان لوگوں کے جھگڑے مرکوز ہوتے رہے ہیں۔ جو یہ چاہتے ہیں۔ کہ قومی معیشت میں سرکار زیادہ سے زیادہ حِصّہ لے۔ اَور جو یہ چاہتے ہیں کہ حکومت کم سے کم دخل انداز ہو۔

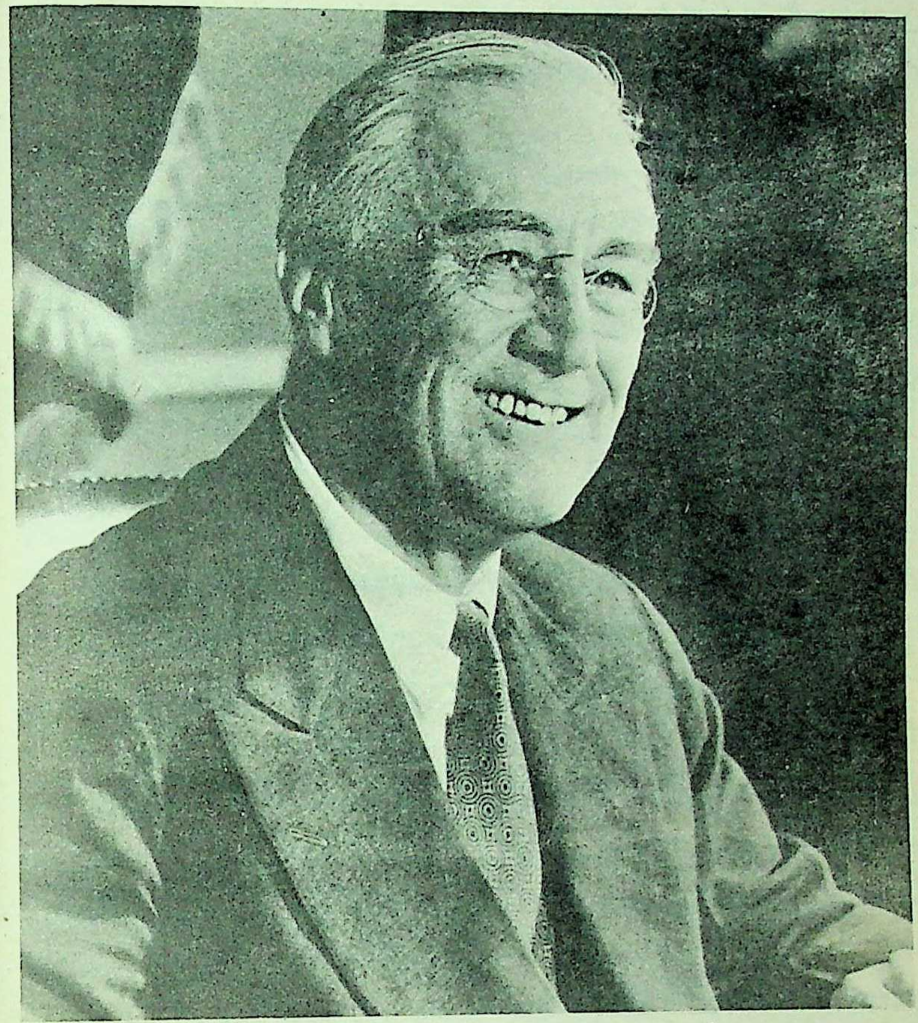

صدر روز ویلٹ ـــ نئی اقتصادی اصلاحات کے معمار

ٹی اے وی ٹینسی ویلی اتھارٹی کا مخفف ہے۔ اس پراجیکٹ میں سرمایہ سرکار نے لگایا ہے۔ اور اس سے سیلاب روکنے۔ بجلی پیدا کرنے اور ٹینسی دریا کی وادی میں زمین کی حفاظت کا کام لیا جاتا ہے۔ اس منصوبے کے مخالفین کا یہ اعتراض ہے کہ سرکار نجی کمپنیوں سے جو بجلی پیدا کرتی ہے۔ ناجائز طور پر مقابلہ کر رہی ہے۔ ان کا یہ خیال ہے کہ سرکار ٹی اے وی کے ذریعہ ایک ایسی مثال قائم کرنا چاہتی ہے' جس کا مقصد نجی اداروں کے مقابلہ میں عوام کو وہی خدمات پیش کرنا ہوگا' جو یہ نجی ادارے اب سرانجام دے رہے ہیں۔ ٹی اے وی کی حمایت کرنیوالے یہ کہتے ہیں۔ کہ یہ ایک شاندار مثال ہے۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ سرکار

1183

کس عمدگی سے نجی اداروں کے ساتھ مِلکر قدرتی وسائل کے بہتر استعمال میں معاون ثابت ہوسکتی ہے ۔ پوسٹل سروس کو چھوڑ کر ریاست ہائے متحدہ امریکہ روائتی طور پر کسی دوسرے ادارے کو قومی بنانے کی پالیسی کے خلاف رہا ہے ۔ ریل روڈ ۔ ہوائی اور جہازی سروسیں نیز ٹیلی گراف اور ٹیلی فون سبھی نجی اداروں کے ہاتھ میں ہیں ۔ اور وہی اُن کو چلاتے ہیں ۔ اکثر میڈیکل ڈاکٹر اپنا کاروبار کرتے ہیں ۔ یا پرائیویٹ ہسپتالوں اور کلینکس کے عملہ میں ہیں ۔ اگرچہ زیادہ سے زیادہ لوگ صحت عامہ کی سکیموں میں شامل ہو رہے ہیں ۔ لیکن یہ سب غیر سرکاری ہیں اور ان کے کفیل خود ممبر ہوتے ہیں ، جو ایک طے شُدہ چندہ دیتے ہیں ۔

اگرچہ معیشت آزاد ہے ۔ اور کاروبار مالکان خود کرتے ہیں ' یا اُن کے نمائندگان ۔ لیکن جیسا کہ ہم نے اُوپر دیکھا حکومت کئی طریقوں سے اس پر کنٹرول رکھتی ہے ۔ مثلاً ٹیکس لگا کر ۔ انٹی ٹرسٹ قوانین بنا کر ۔ فیڈرل بنک سسٹم کے ذریعہ قیمتوں کو قائم رکھنے میں امداد دے کر ۔

ہنری فورڈ ۔ موٹر گاڑیوں کے جادوگر اپنی اُس پہلی موٹر کار میں بیٹھے ہوئے ہیں جو انہوں نے ۱۸۹۶ء میں مکمل کی تھی

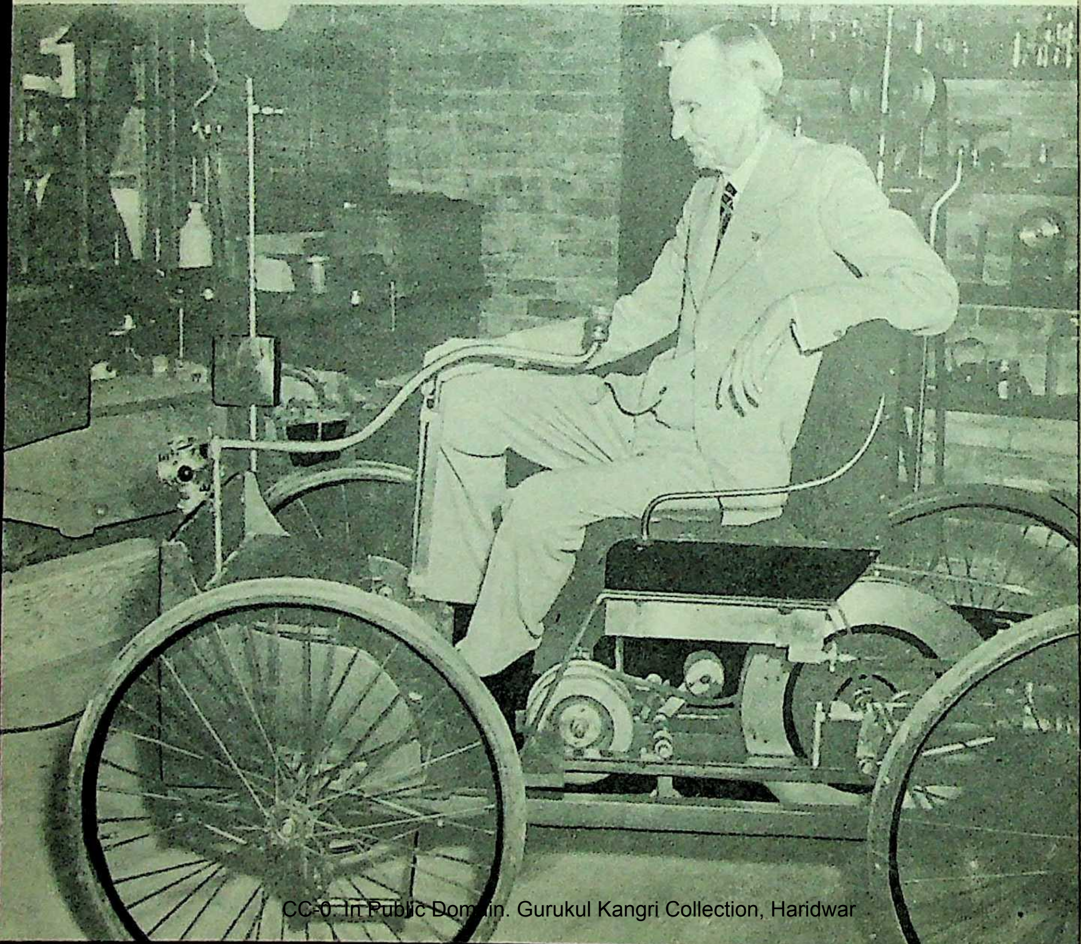

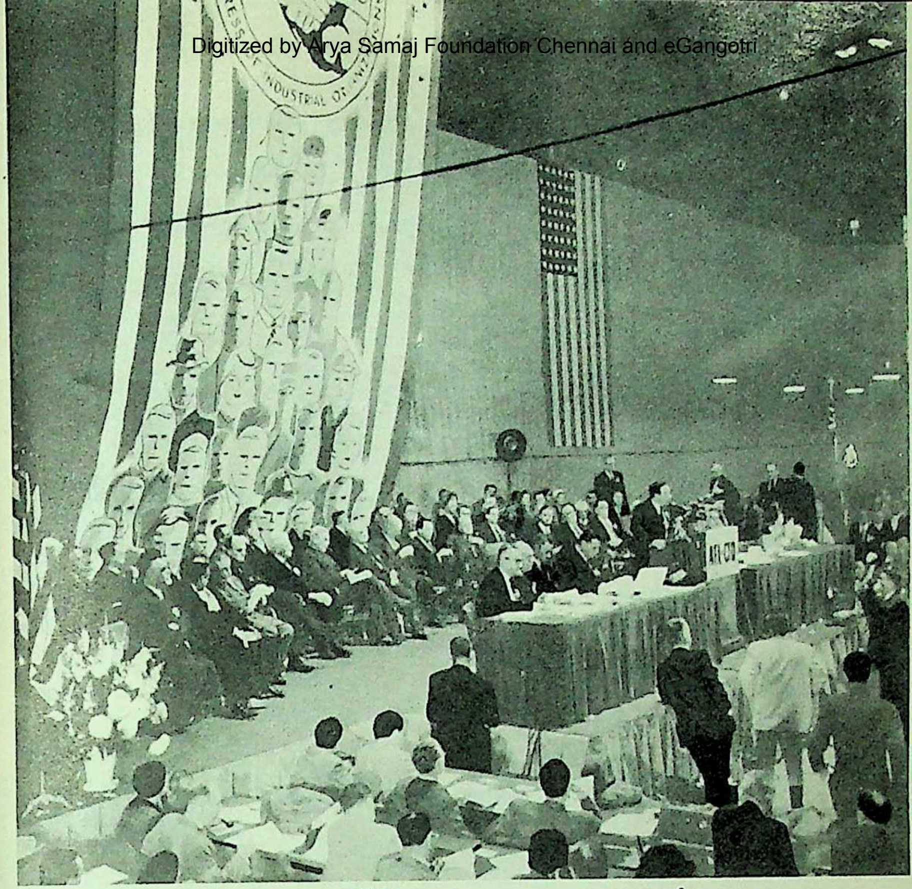

۱۹۵۵ء کا وُہ تاریخی کنونشن جس میں امریکہ کی دو مزدُور تنظیموں کا ادغام عمل میں آیا

خاص طور پر کسانوں سے مہنگے بھاؤ خرید کر، اَور سستے داموں فروخت کر کے۔ اَور خود اپنے اخراجات کو کم کر کے، یا بڑھا کر۔

چونکہ دُکانوں اَور کھیتوں میں مشینری کے استعمال ہونے سے دستی کام کرنے والوں کی ضرورت کم ہو گئی۔ لہٰذا محنت کشوں نے کم اُجرتوں اور بیکاری کا سدِ باب کرنے کی غرض سے اپنی انجمنیں یا گروہ بنائے۔ اوّل اوّل تو ایسی یونینوں میں دونوں قِسم کے یعنی ہُنر منداَور غیر ہُنر مند مزدور ممبر بنائے جاتے تھے۔ لیکن سنہ ۱۸۸۶ء میں امریکن فیڈریشن آف لیبر قائم ہو گئی۔ جس نے تربیت یافتہ کارکنوں کو ان کے پیشوں کے مطابق یونینوں میں بانٹ دیا۔ اور صنعتی کارکنوں کی ایک محدود تعداد کو ممبر بنایا۔ یونین کا صدر سیموئل گومپرز چُنا گیا تھا اَور وہ اپنی موت تک جو سنہ ۱۹۲۴ء میں واقع ہُوئی امریکہ کا سب سے بااثر مزدور لیڈر رہا۔

۱۹۲۰ء اَور ۱۹۳۰ء کے درمیان خوشحالی بہت تھی۔ لہٰذا ٹریڈ یونین کے ممبروں کی تعداد کم ہو گئی۔ لیکن ۱۹۳۰ء اَور ۱۹۴۰ء کے درمیان ۳۰ لاکھ ممبروں سے بڑھ کر یہ تعداد بسرعت ۹۰ لاکھ ہو گئی۔ یونینوں میں نئے

ممبر زیادہ تر فولاد اور آٹوموبائیل کی صنعتوں سے آئے۔ اور وُہ کانگرس آف انڈسٹریل آرگنائیزیشن میں شریک ہُوئے۔ جس نے ایک ہی صنعت کے تمام کارکنوں کو ایک ہی انجمن میں تنظیم دی۔ پُرانی اور محدود قسِم کی صنعتی مزدوروں کی یونینیں امریکن فیڈریشن آف لیبر کے ساتھ ہی رہیں۔ ۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء کے درمیان جب سی آئی او۔ اور اے ایف ایل دونوں ایک بڑی فیڈریشن میں مدغم ہوگئیں۔ تو ان کی مجموعی ممبرشپ ایک کروڑ ۷۰ لاکھ سے بھی زیادہ تھی۔ یعنی مُلک کی تمام مزدور شکتی کا ایک تہائی۔ اِس وقت یونین ممبرشپ کی تعداد ایک کروڑ ۸۰ لاکھ ہے۔

ٹریڈ یونین تحریک کے اِس قدر نشو ونما پانے سے امریکی مزدور کی نہ صرف شان ہی بڑھی ہے۔ بلکہ اسے استحکام بھی نصیب ہُوا ہے۔ یہاں یہ ذکر بھی کر دینا چاہیئے کہ امریکہ میں یہ تحریک یورپ کے کئی مُلکوں کی تحریکوں کے بعد شروع ہُوئی۔ اِس تحریک نے "بڑے کاروبار" کو "بڑے مزدور" کے انداز میں نہایت منصفانہ معیار پر چلنے کے اہل بنایا ہے۔ یونین کے سرکردہ لیڈر اکثر اوقات مُلک کے ٹیلی ویژن سلسلوں پر بولتے رہتے ہیں۔ اور انہیں حکومت کی قائم کردہ تحقیقاتی کمیٹیوں کے سامنے بھی اپنا نکتہ نظر پیش کرنے کے مواقع دیئے جاتے ہیں۔

کینٹکی ڈیم۔ جو ٹینسی ویلی اتھارٹی کی طرف سے بنائے گئے ۳۰ ڈیموں میں سے ہے

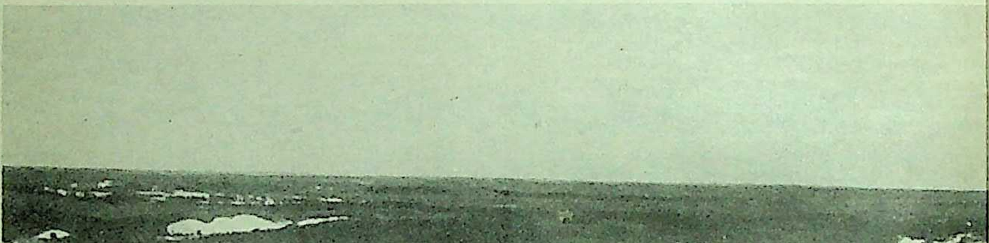

لوگ انہیں بھی اِس قدر جانتے ہیں، جس قدر کہ کاروبار کے لیڈروں کو جانتے ہیں۔ بلکہ انہیں زیادہ ہی جانتے ہوں گے۔

یونائیٹڈ فیڈریشن کی یونینوں کے پاس ہڑتال یا دوسرے ہنگامی حالات سے عہدہ برا ہونے کے لئے کافی سرمایہ ہے۔ اُنہوں نے ماہرین کا عملہ بھی اپنے ساتھ رکھا ہُوا ہے۔ جو انہیں مالکان سے معاملات طے کرنے میں مدد دیتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے۔ کہ ان کی طرف سے صنعتی طریقوں کو بہتر بنانے کی تجاویز آتی ہیں۔

گفتگو کے دوران میں یہ لوگ اُجرتوں اَور اوقاتِ کار سے ہی دلچسپی نہیں لیتے بلکہ دوسری ضمنی مراعات کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ مثلاً انشورنس۔ ریٹائر ہونے کے بعد کی سہولیات۔ با تنخواہ رخصت۔ طبّی امداد۔ اور ایک خاص معیار کی سالانہ اُجرت۔ "متحرک دفعات" کے تحت بعض یونینوں میں اخراجاتِ زندگی کے کم یا زیادہ ہونے کے ساتھ ہی اُجرتوں میں خود بخود کمی یا اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

دوسرے مُلکوں کی مزدور انجمنوں کے برعکس ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں مزدور یونینیں سیاسی پارٹیوں سے کبھی گہرے طور پر منسلک نہیں ہوئیں۔

پیداوار میں اضافہ اَور قوتِ خرید میں بہتری آنے سے مختلف اقتصادی گروہوں کی حالت بھی اسی اعتبار سے اچھی ہو گئی ہے۔ اکثر لوگوں کے پاس اب اپنی موٹر کار ہے ٹیلی ویژن سیٹ ہیں۔ اَور ایسی مشینی اشیا ہیں، جن کا آج سے کچھ دس بیس برس پہلے تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ سفید پوش ملازموں اَور دوسرے پیشہ وَروں کی نسبت فیکٹری کے مزدوروں کی آمدنی زیادہ ہے۔ لہٰذا بڑے بڑے امیروں کی دولت سے موٹی آمدن کا جو بہت بڑا حِصّہ بنا کرتا تھا، اُس میں اب کافی فرق آ گیا ہے۔

اکثر امریکی ماہرینِ اقتصادیات یہ یقین رکھتے ہیں کہ سرکار کے پاس ایسے ذرائع ہیں جن سے وُہ اُونچے معیار کی برسرِ روزگاری پوزیشن قائم رکھ سکتی ہے۔ اور کساد بازاری کو اِس قدر لمبا ہونے نہیں دے گی، جیسا کہ ۱۹۳۰ اَور ۱۹۴۰ء کے درمیان ہو گئی تھی۔ ان کا یہ بھی یقین ہے، کہ آبادی کی نسبت اشیا کی پَیداوار میں اضافے کی صلاحیت سے معیارِ زندگی بتدریج بڑھتا ہی جائے گا۔

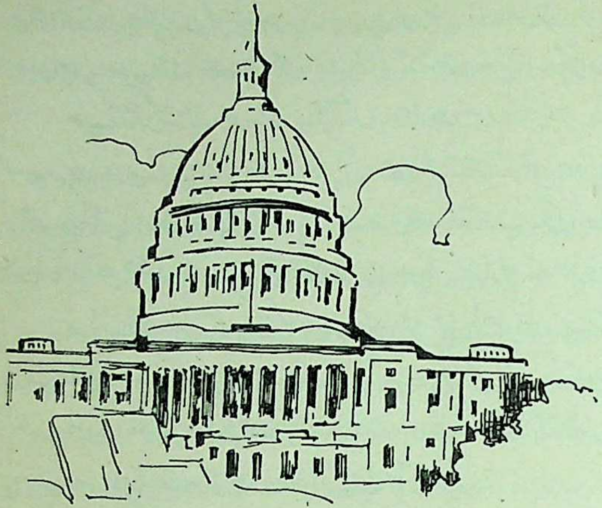

سیاست اَور امریکی کردار

یونانی فلاسفر ارسطو کے وقت سے لیکر اب تک سیاسی مفکر یہ نہیں کہہ سکے کہ آیا کوئی صحیح جمہوری سرکار قائم رہ سکتی ہے۔ اَور ایسی سرکار جو بقول ابراہیم لنکن "عوام سے۔ عوام کی اَور عوام کیلئے ہو" اس قدر طاقتور اَور مستحکم ہوگی کہ وُہ اندرونی گڑبڑ اَور غیر مُلکی دشمنوں سے اپنی حفاظت آپ کر سکے؟ کیا ایسی سرکار اکثریت کی خواہشات پر لبیک کہتے ہُوئے بھی اقلیتوں کے حقوق اَور اختیارات کی حفاظت کے اہل ہو سکے گی؟

اِس قِسم کی کوشش امریکہ ایسے مُلک میں خاص طور پر مُشکل ہوگی۔ مُلک بڑا ہے اَور گوناگوں قِسم کا مُلک کا کوئی چرچ نہیں اَور نہ مشترک مذہبی اعتقادات ہیں۔ لوگ یا اُن کے آباواجداد تمام باہر سے آئے ہیں۔ انگلستان کے خلاف انقلاب کے وقت امریکیوں کی جو مشترک روایت تھی، وُہ علیحدگی پسندی۔ بغاوت اَور ماضی کی صُورتِ حالات کے خلاف بے اطمینانی تک محدود تھی۔

اس کے باوجُود امریکہ کو آزاد پاپولر سرکار قائم رکھنے میں جو کامیابی ہُوئی ہے اس کے کئی وجُوہ ہیں۔ سیاسی طور پر اہم تریں اہمیت امریکی آئین کو دی جانی چاہیئے۔ آئین بمعہ ترمیموں کے اس وقت تک سب سے زیادہ موثر قوت رہا ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں آج تک کِسی صدر یا کِسی پارٹی نے ناجائز طور پر اختیارات پر قبضہ نہیں کیا۔ یہاں کوئی فوجی انقلاب نہیں آیا اگرچہ ایک طویل اَور خونی خانہ جنگی ہُوئی۔ کیا یہ بات حیران کُن نظر آتی ہے کہ اٹھارہویں صدی کا لِکھا ہُوا ایک آئین ایسے عوام پر جاری وساری رہے جنہیں

خیالی اصولوں سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ اور جو تبدیلی اور تجربہ کے اس قدر متوالے ہوں؟ اس سوال کے جواب کے لئے ہمیں پھر سے ان حالات کا مطالعہ کرنا چاہیئے، جن کے تحت امریکہ آباد ہوا تھا۔

جیسا کہ گزشتہ باب میں بیان کیا گیا ہے نو آبادکاروں میں سے بیشتر رضاکارانہ طور پر امریکہ آئے تھے۔ لیکن وہ کسی سرکار یا زمیندار یا مالک وغیرہ سے کچھ انتظام کر کے آئے تھے۔ اور ان دونوں گروہوں کے مفادات ایک سے نہ تھے۔ اپنے آپ کی حفاظت کی خاطر یہ نو آبادکار اپنے ساتھ نہایت خوبی سے لکھے ہوئے کچھ معاہدے لائے تھے۔ جن میں ان کے حقوق کا تعین کیا گیا تھا۔ اور ان میں خود مختاری کے حقوق بھی تھے۔

جب مساچوسٹس کے ابتدائی آبادکاروں کو جو کہ مشہور "مے فلاور" جہاز کے ذریعہ آ رہے تھے۔ یہ معلوم ہوا، کہ وہ ورجینا کمپنی کے اختیارات سے باہر والی زمین پر اترے ہیں اور اگرچہ اس کمپنی نے ان کے آنیکا انتظام کیا تھا۔ تو انہوں نے ایک باقاعدہ معاہدہ لکھا۔ جس کے تحت انہوں نے "خود کو ایک شہری سیاسی انجمن میں متحد" کرنیکا فیصلہ کیا۔ اور اس طرح سے امریکہ میں سیلف گورنمنٹ کا آغاز ہوا۔

شاہ انگلستان نے مساچوسٹس میں آباد ہونیوالوں میں جو چارٹر دیئے تھے، ان میں یہ پوری طرح بیان نہیں کیا گیا تھا۔ کہ مساچوسٹس پر برطانوی پارلیمنٹ کے قوانین لاگو ہوں گے۔ لہذا مساچوسٹس کے لیڈرز برطانوی سرکار سے اپنے اکثر جھگڑوں کے وقت یہ دلیل دیتے تھے۔ کہ مساچوسٹس کا انتظام وہیں کے منظور شدہ قوانین سے ہوگا۔ جن کی منظوری البتہ شاہ برطانیہ دے گا۔

جب ۱۷۶۳ء کے بعد انگلستان نے نو آبادیوں پر زیادہ بھاری ٹیکس لگانے شروع کر دیئے تو نو آبادی کے لیڈروں نے اس پر اعتراض کیا۔ ان کا کوئی نمائندہ برطانوی پارلیمنٹ میں نہ تھا۔ لہذا انہوں نے کہا۔ کہ پارلیمنٹ کو ان کی رضامندی کے بغیر ٹیکس لگانیکا کوئی اختیار نہیں ہے۔ "بلا نمائندگی کے ٹیکس لگانا ظلم ہے"۔ کچھ عرصہ تک تو یہ لوگ شاہ برطانیہ کے قوانین کو تسلیم کرتے رہے۔ لیکن چونکہ ان کے اکثر سیاسی خیالات کا منبع ۱۶۴۲، اور ۱۶۸۸ء کے انقلابات تھے۔ لہذا ان کے لئے تاج برطانیہ سے قطعی طور پر تعلق منقطع کر لینا آسان تھا۔

عام طور پر جسے امریکی انقلاب یا ۱۷۷۶ء کے انقلاب کا نام دیا جاتا ہے۔ اور جس میں برطانیہ اعظمیٰ کے خلاف مسلح جنگ لڑی گئی۔ اسے صحیح طور پر اگر بیان کرنا ہو۔ تو کہنا چاہیئے۔ کہ وہ ایک نو آبادی کی جنگ آزادی تھی۔ اس کا آغاز نو آبادی کے قانون سازوں نے کیا تھا۔ جو اپنے ابتدائی اختیارات کے تحت کام کرتے چلے گئے۔ اور جنہوں نے قانون کے مطابق قائم شدہ خود مختار سرکار کے باقاعدہ نظام کو کسی طرح بھی ٹوٹنے نہ دیا۔ حقیقت تو یہ ہے، کہ ۱۸۶۱-۶۵ء کی خانہ جنگی کے دوران اور کچھ دیر بعد تک کے چھوٹے سے وقفے کو چھوڑ کر جس کا اثر جنوبی ریاستوں پر پڑا تھا۔ اصلی ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں سترھویں صدی سے اب تک بلا کسی تردد کے باقاعدہ سیلف گورنمنٹ قائم چلی آ رہی ہے۔ گویا کہ دنیا میں ایسی جو حکومتیں بھی قائم ہوئیں۔ ان میں یہ سب سے پرانی حکومتوں میں سے ہے۔ اور اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ امریکی فیڈرل نظام کی پیچیدہ کثرت میں ریاستی سرکاروں کی اہمیت کس قدر زیادہ ہے۔

چونکہ امریکہ کے نو آبادیاتی لیڈر تحریر شدہ اصولوں کو اہم قرار دیتے تھے۔ اور "بنی نوع انسان کی رائے کا مناسب احترام کرتے تھے۔ لہذا انہوں نے خود مختار آزاد قوم بننے کے وجوہ کو نہایت وضاحت کے ساتھ اپنے عوامی بیانات میں

کہہ دیا۔ چار جولائی سنہ ۱۷۷۶ء کے اعلانِ آزادی کو ایک کمیٹی نے طے کیا تھا۔ جس میں بنجمین فرینکلن۔ جان آدمز اور ٹامس جیفرسن تھے۔ آئین کے تمہیدی بیان اور ابراہیم لنکن کے گیٹسبرگ کی تقریر کے ساتھ مِلکر یہ اعلانِ آزادی امریکی سیاسی اعتقاد کا سرچشمہ ہے۔

اس کا مندرجہ ذیل حصّہ اکثر طور پر دہرایا جاتا ہے:۔

"ہم اِن سچائیوں کو واضح تسلیم کرتے ہیں کہ سب انسانوں کو مساوی پیدا کیا گیا ہے۔ اور یہ کہ خالق نے اُنہیں کچھ اٹل حقوق دیئے ہیں۔ اور ان حقوق میں زندگی۔ آزادی اور تلاشِ مسرّت کے حقوق بھی شامل ہیں۔ اور ان حقوق کے تحفظ کے لئے انسان حکومتوں کو قائم کرتے ہیں۔ جو اپنے جائز اختیارات رعیت کی رضامندی سے حاصل کرتی ہیں۔ اور جب کوئی طرزِ حکومت ان مطمحِ ہائے نظر کی تباہی کا کارن بنتی ہے۔ تو یہ عوام کا حق ہے۔ کہ وُہ اسے تبدیل یا ختم کر دیں۔"

انقلابی جنگ کے دوران میں اور اس کے کچھ بعد تک امریکہ میں ڈھیلی ڈھالی کنفیڈریشن آف سٹیٹس کے ذریعہ راج چلایا جا رہا تھا۔ لیکن اس کے پاس حکومت کرنے کے اختیارات اطمینان بخش نہ تھے۔ ایک قومی آئینی اجتماع میں بہت سی بحث کے بعد ۱۷۸۷ء میں ایک نئی حکومت کے قائم کرنیکا فیصلہ ہوا۔ اور منظوری کے لئے تیرہ ریاستوں کی منتخب کنونشنوں میں اسے پیش کیا گیا۔ اس آئین کے بابِ تمہید میں اعلان کیا گیا تھا:۔

"ہم ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے لوگ۔ ایک زیادہ مکمّل یونین بنانے۔ انصاف قائم کرنے۔ اندرونِ ملک امن و سکون لانے۔ اجتماعی دفاع کی غرض سے۔ عوامی بہبود کے لئے نیز اپنے اور اپنے بچوں کے لئے آزادی کی برکات کو حاصل کرنیکی خاطر ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے لئے ایک آئین کا حکم دیتے ہیں۔ اور اسے قائم کرتے ہیں۔"

جیسا کہ "عوامی بہبود" اور "ایک زیادہ مکمل یونین" کے فقروں سے پتہ چلتا ہے۔ نئے فیڈرل آئین کے حمایت کنندگان ایک طاقتور مرکزی سرکار قائم کرنا چاہتے تھے، جو لین دین کی حفاظت کر سکے۔ تجارت اور اشیا کے بنانے میں معاون ثابت ہو سکے۔ ان کے مخالفین نے ایک انٹی فیڈرلسٹس پارٹی بنائی۔ جس میں زیادہ تر چھوٹے کسانوں اور اجرت پانے والے مزدوروں کے نمائندے شامل تھے۔ یہ انٹی فیڈرلسٹ پارٹی۔ بتدریج بدلتے ہوئے صدر ٹامس جیفرسن اور انڈریو جیکسن کی پارٹی بن گئی۔ بطور ڈیموکریٹ پارٹی کے پہلی جنگِ عظیم میں یہ صدر وڈرو ولسن کی پارٹی تھی اور دوسری جنگِ عظیم میں صدر فرینکلن ڈی روز ویلٹ کی۔ فیڈرل پسند پہلے تو وِگس بنے۔ اور اس کے بعد ری پبلیکن میں تبدیل ہو گئے۔ اور انہی نے ۱۸۶۱ء میں ابراہیم لنکن کو اپنا پہلا صدر چُنا۔ ری پبلیکن صدروں میں تھیوڈور روز ویلٹ۔ اور ڈوائٹ آئزن ہاور کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

بہت سے لوگوں کے ذہن میں ابھی تک یہ بات پائی جاتی ہے۔ کہ ری پبلیکن پارٹی کا تعلق تاجروں سے۔ اور محصولات سے حفاظت لینےوالوں سے ہے۔ لیکن علاقائی تصورات بھی کافی اہم ہیں۔ جنوبی علاقوں کے دیہاتی ڈیموکریٹوں میں اور شمال کے شہری ڈیموکریٹوں میں بھی کافی فرق پایا جاتا ہے۔ اِس طرح وسط مغرب کے قدامت پسند ری پبلیکنوں اور مشرق کے لبرل ری پبلیکنوں میں خاصہ فرق ہے۔

درحقیقت ری پبلیکن اور ڈیموکریٹ دونوں پارٹیاں ہی نرم قسم کی کولیشنیں ہیں، جن کا روپ ایک انتخاب سے دوسرے انتخاب تک بدلتا رہتا ہے۔ خاص طور پر کسان تو کبھی ایک اور کبھی دوسری سے ناطہ جوڑتے رہتے ہیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہُوا ہے۔ کہ کانگرس میں بہت کم حالتوں میں کِسی ایک قانون کو ساری پارٹی کی حمایت حاصل ہُوئی ہو۔ نمائندگان اپنے ضمیر کی آواز کے مطابق یا اپنے علاقوں کے لوگوں کی خواہشات کے احترام میں ووٹ ڈالتے ہیں۔

اکثر ریاستوں میں ووٹروں کا اندراج سیاسی پارٹی کے نام سے ہوتا ہے لیکن جو چاہیں بطور آزاد ووٹر کے اندراج کرا سکتے ہیں۔ ابتدائی یا آغاز کے انتخابوں میں یہ ووٹر اپنی پارٹی کو مقامی۔ ریاستی اور قومی عہدوں کیلئے اُمیدوار نامزد کرنے میں امداد دیتے ہیں۔ وہ یا تو براہِ راست ووٹ دیتے ہیں۔ تاکہ ایسے امیدوار نامزد ہو سکیں جنہیں وہ اپنی پارٹی کی طرف سے انتخاب میں کھڑا دیکھنا چاہتے ہیں۔ اِس مقصد کیلئے وُہ خالی خانوں میں اپنی مرضی سے اپنے اُمیدوار کا نام لکھ دیتے ہیں یا پھر وُہ اپنے نمائندے چن دیتے ہیں۔ تاکہ وہ ریاستی یا قومی اجتماعوں میں حِصّہ لیں جو پارٹی اُمیدوار نامزد کرنے کے لِئے منعقد ہوتے ہیں۔

آخری انتخاب میں ووٹروں کو ان کے علاقوں میں بیلٹ دیئے جاتے ہیں، جن پر اُمیدواروں کے نام درج ہوتے ہیں۔ قدرتی امر ہے کہ ووٹنگ بالکل خُفیہ ہوتی ہے۔ ووٹر اپنی پارٹی کے نمائندوں کو بھی ووٹ دے سکتے ہیں۔ اور اِس طرح وہ محض ایسے اُمیدواروں کو چُنتے ہیں، جو ان کی اپنی اپنی پارٹی سے ہوتے ہیں۔ لیکن ایسا بھی ہوتا ہے اور اکثر امریکی ہی کرتے ہیں۔ کہ وُہ ایسے اُمیدواروں کے درمیان اپنے ووٹ بانٹ دیتے ہیں، جنہیں وُہ انفرادی طور پر اس کے اہل پاتے ہیں۔

بیلٹ پر نام لِکھوانے کیلئے کِسی امیدوار کیلئے ضروری نہیں ہے کہ وُہ ایک یا دوسری سیاسی پارٹی سے

ڈیموکریٹک پارٹی کنونشن منعقدہ ۱۹۶۰ء جس میں کینیڈی کو صدارت کے لِئے نامزد کیا گیا

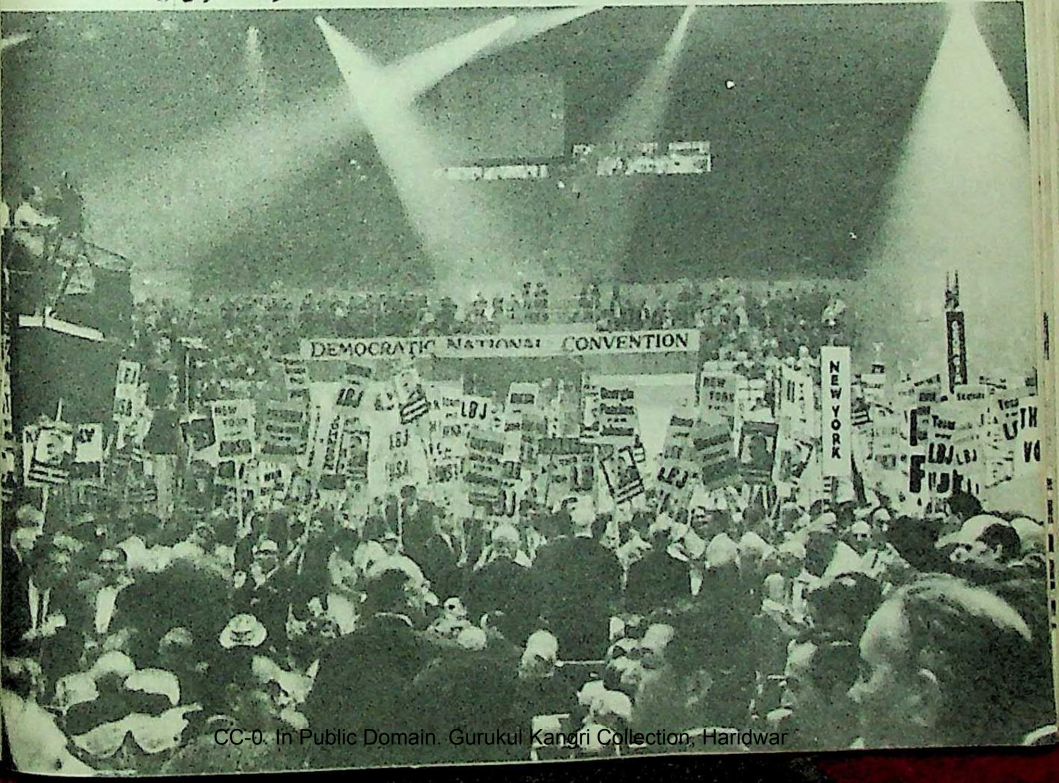

تعلق رکھتا ہو۔ اگر کسی امیدوار کو عرضداشتوں پر مناسب تعداد میں دستخط مل جاتے ہیں تو اسے بطور ایک آزاد امیدوار کے بیلٹ پر درج کر دیا جاتا ہے۔

دونوں بڑی پارٹیوں کی سیاسی صورت حالات اور تشکیل کی بنا پر امریکی جمہوریت کا نمائندہ کردار قائم رہنے میں مدد ملتی ہے۔ دوسری اقلیتی پارٹیاں بھی ہیں لیکن ڈیموکریٹک اور ری پبلیکن پارٹیوں میں شدید قسمت کی مخاصمت ہونے کی بنا پر دونوں پارٹیاں زیادہ سے زیادہ مفادات کو اپیل کرتی ہیں۔ اور دوسری پارٹیوں کو بہت کم ووٹ ملتے ہیں۔ کبھی کبھار اقلیتی پارٹیوں کو بھی کافی حمایت حاصل ہو جاتی ہے۔ لیکن امریکی عام طور پر اپنے ووٹ ایسے امیدواروں کو دینا پسند نہیں کرتے، جن کے چُنے جانیکا کوئی امکان نہ ہو۔

مقاماتی اور جماعتی مفادات میں المناک جھگڑا پیدا ہونے سے امریکہ میں ۱۸۶۱ - ۱۸۶۵ء کے درمیان خانہ جنگی ہوئی۔ اس سے کافی برس پہلے اس امر پر جھگڑا چلا آ رہا تھا۔ کہ مغرب میں جو نئی نوآبادیاں قائم کی گئی ہیں اُن میں غلامی کو اجازت دی جائے یا نہ دی جائے۔

اس جھگڑے نے کنساس کے علاقے میں غلامی کے حمایت کنندگان اور مخالفین کے درمیان تشدد کی صورت اختیار کر لی۔ شمال کے تاجروں اور صنعت کاروں کا خیال تھا کہ اگر غلامی کا نظام جو جنوبی ریاستوں میں قائم ہے، تیزی سے بڑھتی ہوئی قوم کی اکثر ریاستوں میں پھیل گیا۔ تو اس سے صنعتی ترقی میں جسے وہ اس قدر عزیز رکھتے تھے، رخنے پڑ جائیں گے۔ ۱۸۶۰ء میں ڈیموکریٹ پارٹی میں انسداد غلامی کے سوال پر اختلاف پیدا ہو جانے سے غلامی کی مخالف ری پبلیکن پارٹی انتخاب جیت گئی۔ لیکن اس سے پیشتر کہ ابراہیم لنکن نے اپنے عہدے کا حلف اُٹھایا ہو بہت سی جنوبی ریاستوں نے یونین سے علیٰحدگی اختیار کر لی۔ جنوبی ریاستوں کا انحصار زیادہ تر کپاس کی آمدن پر تھا۔ غلامی کی خرید کے لئے جو کہ کپاس کی چُنائی کیا کرتے تھے۔ کھیتوں کے مالکان کو بہت سرمایہ لگانا پڑتا تھا۔ اور اِس بنا پر کئی مالکان مقروض ہو گئے تھے۔ اگر علاقوں کو آزاد کر دیا جاتا ہے تو جنوب کی تمام معیشت تباہ و برباد ہو جائے گی۔

یونین سے علیٰحدہ ہونے کے حق کا دعویٰ کرتے ہوئے جنوب نے اِس بات پر زور دیا کہ مختلف ریاستیں خود مختار رہیں۔ اور انہوں نے فیڈرل سرکار کو محض حقوق تفویض کیے ہوئے ہیں۔ جن کو وہ اس حالت میں جبکہ یہ سرکار طے شدہ مطمح ہائے نظر کو تباہ کر رہی ہو" واپس لے سکتی ہیں۔ لنکن نے جو غلامی کے خلاف تھے، خود ایک تجویز پیش کی کہ جنوبی ریاستیں آہستہ آہستہ غلاموں کو آزاد کرتی جائیں۔ اور ان کو ان سے نقصان کا معاوضہ بھی دیدیا جائیگا۔ لیکن وہ ناکام رہے۔ وہ اِس بات کو تسلیم نہیں کرتے تھے کہ ریاستوں کو یونین سے علیٰحدہ ہونیکا حق بھی حاصل ہے۔ وہ اس کو غیر آئینی قدم اور بغاوت سے تعبیر کرتے تھے۔ یونین کو بچانے کی غرض سے انہیں طوعاً و کرہاً جنگ لڑنا پڑی۔

شمال کو جنوب پر اقتصادی اور صنعتی برتری حاصل تھی۔ نیز اقتصادی غلامی کے ادب نے جس میں مشہور کتاب انکل ٹامس کیبن بھی تھی۔ غلامی کے خلاف شدید قسم کے جذبات کو ہوا دیدی۔ لہٰذا شمال خانہ جنگی میں کامیاب رہا۔ اس خانہ جنگی میں اِس قدر جانی اور مالی نقصان ہُوا کہ نپولین کی جنگوں سے اب تک نہیں

ہُوا تھا۔ جنوبی ریاستوں میں سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالات بحال ہونے میں بہت سال صَرف ہُوئے۔ اسی طرح ڈیموکریٹ پارٹی کو بھی جسے باغی پارٹی ہونے سے بہت نقصان رہا تھا، اپنا وقار بنانے میں کافی محنت کرنا پڑی۔

خانہ جنگی میں شمال کو فتح نصیب ہونے کی وجہ سے ری پبلیکن پارٹی اور شمالی صنعت کاروں نے قوم پر لگ بھگ پوری طرح کنٹرول کر لیا۔ انہوں نے تیزی کے ساتھ ریل روڈ سسٹم کو وسعت دی اور مُلک کے وسائل کو بسرعت کام میں لانا شروع کر دیا۔ ان غیر متوازن اختیارات نے بہت سے نامناسب اثرات پیدا کئے۔ اور ان کا السداد انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل کے دس برسوں میں اس وقت جا کر ہُوا جبکہ بتدریج پارٹیوں میں توازن قائم ہُوا۔

پارٹیوں میں توازن دراصل امریکی طرزِ حکومت کا ایک عنصر ہے اور آئین بنانے والوں کی اس امر پر نظر نہ تھی۔ انکی توجہ کا مرکز یہ تھا کہ قانون ساز مجلس، ایگزیکٹو اور عدالتوں کے درمیان توازنِ اقتدار قائم رہے۔ نیز ریاست اور قومی اقتدار میں بھی التعاون ہو۔ فیڈرل نظریہ کے لوگوں کے مطابق امریکہ کی مرکزی سرکار حقیقیاً خود مختار ریاستوں کی فیڈریشن ہے اور اس کا اعلان تو خود ”ریاست ہائے متحدہ امریکہ“ کا نام ہی کر دیتا ہے۔ اس نظریے کی وضاحت و تشریح آئین کی دسویں ترمیم میں کی گئی ہے۔ جس میں اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ جو اختیارات آئین کے ذریعہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو بہ وضاحت نہیں دیئے گئے وہ ”خود ریاستوں یا اُن کے عوام کے پاس ہیں۔“

ریاست ہائے متحدہ میں صدر کا عہدہ پہلے صدر جارج واشنگٹن کے دور سے لیکر بہت طاقتور عہدہ چلا آرہا ہے۔ صدر مسلح فوجوں کے کمانڈر ہیں۔ وہی حکومت کے تمام محکموں کے افسران اعلیٰ کو عہدوں پر فائز کرتے ہیں۔ وہی سفیروں کا انتخاب کرتے ہیں۔ اور سپریم کورٹ میں جگہ پُر کرتے ہیں۔ انہیں کسی قانون کو رد کرنیکا اختیار حاصل ہے۔ اور وہ کسی قانون کی تجویز پیش کر سکتے ہیں۔ اکثر جمہوریتوں کے برعکس جہاں کہ ریاست کا سربراہ کوئی اور شخص ہوتا ہے اور حکومت کا سربراہ کوئی اور۔ امریکہ میں یہ دونوں عہدے صدر سے ہی پاس ہیں۔ وہ اس سیاسی پارٹی کے بھی صدر ہیں، جو انہیں چُنتی ہے۔

لیکن اس کے باوجود صدر کے اختیارات واضح طور پر تعین کر دیئے گئے ہیں۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی کانگرس جس کی تشکیل مختلف ریاستوں اور ان ریاستوں کے اضلاع سے منتخب شُدہ نمائندے کرتے ہیں۔ اپنے اختیارات کی شدت کے ساتھ حفاظت کرتی ہے۔ اس نظریہ کی کڑی قانون ساز مجلس اور برطانوی اختیارات کے درمیان جو جھگڑا نو آبادیاتی وقت میں ہُوا، اس سے ملتی ہے۔

اگرچہ صدر کسی قانون کو نامنظور کر سکتے ہیں۔ تاہم کانگرس اس قانون کو دو تہائی اکثریت سے دوبارہ منظور کر سکتی ہے۔ کانگرس ہی کو سفیروں اور ایگزیکٹو میں جو آسامیاں بھری گئی ہیں، ان کی منظوری دینا ہوتی ہے۔ چونکہ کانگرس کا بجٹ پر کنٹرول ہے۔ لہٰذا وہ یہ فیصلہ کر سکتی ہے۔ کہ مسلح فوجوں کو، اور دوسرے محکموں کو کس قدر روپیہ خرچ کے لئے دیا جائے۔

قانون سازی کی تیاری کی غرض سے کانگرس کی کمیٹیوں کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ وہ اجلاس بُلائیں اور شہادتیں

طلب کریں۔ جو لوگ ان کمیٹیوں کے سامنے پیش ہوتے ہیں، ان سے کانگرس کی کمیٹیاں مناسب اطلاعات لینے کی حقدار ہوتی ہیں۔ جن اجلاسوں میں امریکی کمیونسٹ پارٹی کے خفیہ عمل دخل پر تحقیقات ہوئی تھیں، ان کا ذکر دنیا بھر میں ہوا۔ یہ محسوس کیا گیا تھا کہ بعض اوقات قانون کے مقصد سے تجاوز کیا گیا ہے۔ اور تفتیش و تحقیق اپنی حد سے بڑھ کر سزا جوئی اور جوڈیشل طرز کی ہو گئی ہے۔ اگرچہ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کمیونسٹوں کا خفیہ اثر اس سے کہیں خطرناک ہے جتنا کہ بہت سے امریکی خیال کر رہے تھے۔ لیکن اس میں تو کچھ کلام نہیں کہ جمہوری حکومت میں کانگرس کی تحقیقات بہت کارآمد ثابت ہوتی ہیں۔ ٹرسٹوں۔ ٹریڈ یونینوں۔ فرموں اور پبلک زمینوں کے استعمال میں جو تحقیقات کی گئی ہیں انہوں نے اکثر ایسی خرابیوں سے پردہ اٹھا دیا۔ جن کا انسداد کرنے کی فوری ضرورت تھی۔ اس قسم کی اطلاعات حاصل کرنے کے لئے حلف دلانیکا اختیار بہت ضروری ہوتا ہے۔ لیکن جہاں کوئی ایسی شہادت ہو، کہ اس سے خود گواہ کے خلاف کوئی بات جاتی ہو، تو گواہ کو حق حاصل ہے۔ کہ وہ ایسی شہادت دینے سے انکار کر دے۔

صدر اس بات پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔ کہ ان کی پارٹی کے سارے ممبران ان اقدامات پر صاد کریں گے، جن کی وہ سفارش کر رہے ہیں۔ ممبران کو اپنے اپنے حلقہ کے سامنے جوابدہ ہونا ہے، صدر کے سامنے نہیں۔ صدر کو کانگرس کے خلاف تادیبی کارروائی کرنے کا کوئی اختیار حاصل نہیں اور نہ اس کو توڑ سکتے ہیں۔ انہیں آسامیاں پر کرنے اور اپنے مقصد کو پانے کیلئے سمجھوتوں اپنے عہدوں کے وقار اور اپنے مخصوص اختیارات سے ہی کام لینا ہوتا ہے۔

پارٹیوں میں اس قدر گہرا توازن پایا جاتا ہے۔ کہ ایسا اکثر ہوا۔ کہ کانگرس میں اس پارٹی کی اکثریت ہے، جو صدر کے خلاف ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ مخالف پارٹی کے ہاتھ میں تمام اہم کمیٹیوں کی صدارت ہو گی۔ صدر کا چناؤ چار برس کے لئے ہوتا ہے اور وہ اس عہدہ پر اتنی مدت رہتے ہیں، چاہے مجلس قانون ساز میں کچھ ہی رونما کیوں نہ ہو۔

صدر کا صرف کانگرس سے ہی کچھ پیچیدہ رشتہ نہیں ہے۔ بلکہ ان ۵۰ ریاستی سرکاروں سے بھی ہے، جن کے بارے میں ہم پہلے کہہ آئے ہیں کہ وہ اپنے ایسے تمام اختیارات کی مالک ہوتی ہیں جو فیڈرل سرکار کو آئین کی رو سے خاص طور پر نہیں دیئے جاتے۔ طلاق۔ آٹوموبائیل کے اندراج۔ مشروبات کی فروخت۔ جرائم کی سزا وغیرہ مختلف معاملات میں ریاستوں میں جو قوانین پائے جاتے ہیں، ان میں بہت اختلاف ہے۔ کانگرس کے نمائندوں اور سینیٹروں کے اپنی اپنی ریاستوں سے گہرے مراسم ہوتے ہیں اور جن کنونشنوں میں صدر کی نامزدگی ہوتی ہے وہاں ان لوگوں کا بہت اثر و رسوخ ہوتا ہے۔ بڑی بڑی ریاستوں کے گورنروں کا بھی بہت رسوخ ہوتا ہے۔ اور اکثر اوقات ہی گورنر صدارت کے عہدہ کے لئے امیدوار کھڑے ہوتے ہیں۔ کنونشنوں اور خود انتخاب میں چناؤ ریاستوں کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ نامزدگی کی کنونشنوں کے خوبصورت میلوں میں تو ریاستی خود مختاری پر خاص طور پر زور دیا جاتا ہے۔

انجام کار ہمیں فیڈرل اور ریاستی کورٹ سسٹم کا جائزہ لینا ہے۔ جس کی سربراہ سپریم کورٹ ہے۔ سپریم کورٹ کے ایک موجودہ جسٹس نے کہا ہے کہ:۔

"ہمارے موجودہ حالات میں سپریم کورٹ کا یہ کام ہے۔ کہ وہ حکومت اور فرد کے درمیان ثالث بنے، اور ریاستی اور قومی اختیارات کی حد بندی کرے۔ فرد کے مختلف ریاستوں سے اور فرد کے ریاست ہائے متحدہ سے کیا تعلقات ہوں۔ نیز پچاس ریاستوں کے آپس میں اور یونین سے کیا رشتے ہوں۔ ان کا آخری طور پر فیصلہ کرنیکا

واشنگٹن میں امریکہ کی عدالت عالیہ کی عمارت

اختیار عدالت کو حاصل ہے۔"

سپریم کورٹ کی سب سے اہم ذمہ داری یہ ہے۔ کہ وُہ دیکھے کہ آیا کانگرس اور مختلف ریاستوں نے جو قوانین منظور کیے ہیں وُہ آئینی طور پر درست ہیں۔ یہ اس امر کا فیصلہ بھی کرتی ہے کہ آیا چھوٹی عدالتوں اور ریاستی و مرکزی سرکاری افسروں نے قانون کے مطابق کام کیا ہے۔ سپریم کورٹ ان امور میں خود کوئی پہل نہیں کرتی اور نہ ہی تصوّراتی طور پر پالیسی یا اصول کے سوالات پر کوئی حکم لگاتی ہے۔ جب شہری مناسب خیال کرتے ہیں کہ چھوٹی عدالتوں کے فیصلوں کو بدلوائیں، تو وُہ اس سے بڑی عدالتوں کے سامنے عذر خواہی کرتے ہیں۔ اپیل کے لئے سب سے بڑی عدالت سپریم کورٹ ہے۔ سپریم کورٹ اپنے فیصلوں کے جواز میں جو وضاحت پیش کرتی ہے وُہ امریکہ میں جمہوری اور آئینی سرکار کے اصولوں کے مستند ترین بیانات میں سے ہوتی ہے۔ یہ سپریم کورٹ کا ہی ایک فیصلہ تھا۔ کہ نیگروؤں اور سفید نام لوگوں کے الگ الگ سکول غیر آئینی ہیں۔

امریکی آئین کا احترام سپریم کورٹ تک کیا جاتا ہے جو اس کی توضیح کرنے والا ادارہ ہے۔ اگرچہ ریٹائر ہونے والے جسٹس کی جگہ تقرر صدر کرتے ہیں۔ لیکن اس سے آگے عدالت پر اُن کا

کوئی اختیار نہیں رہتا۔ جب صدر فرینکلن ڈی روز ویلٹ نے ۹ روائتی ججوں کی تعداد میں اضافہ کر کے ایسے لوگوں کا تقرر کرنے کی تجویز پیش کی، جو ان کی اصلاحات کے حامی تھے تو عوام نے اِسقدر شدید مخالفت کی کہ صدر روز ویلٹ کو اپنی تجویز ترک کر دینا پڑی۔

سپریم کورٹ میں جو مقدمات پیش ہوتے ہیں، ان میں سے بیشتر کا تعلق آئین کی پہلی دس ترمیموں یعنی قوم کے مسودۂ اختیارات Nation's Bill of Rights سے ہوتا ہے۔ ان کے تحت کانگرس کو ایسے قوانین بنانے سے منع کیا جا چُکا ہے، جن سے مذہب پر اثر پڑے، یا آزادانہ پرستش میں کوئی خلل آئے۔ یا آزادئ تحریر و تقریر محدود ہو، یا پُرامن اجتماع نہ کیا جا سکے۔ ان ترمیموں سے غیر قانونی تلاشیوں اور گرفتاریوں سے حفاظت ہوتی ہے اور بِلا قانونی چارہ جوئی کے کِسی شخص کو زندگی۔ آزادی اور جائداد سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔" اگر سرکاری افسران غیر قانونی طور پر کوئی قدم اُٹھائیں تو کوئی شخص یا گروہ اس کے خلاف ہر دم عدالت میں اپیل کر سکتا ہے۔ جن لوگوں پر کوئی جُرم کرنیکا الزام لگتا ہے۔ چاہے یہ الزام ریاست کے خلاف جُرم کرنیکا ہو۔ انہیں آئینی اختیارات حاصل ہیں کہ وُہ کھُلے عام جیوری کے سامنے انصاف مانگیں۔ گواہ طلب کریں اور اپنے خلاف شہادت دینے سے انکار کر دیں۔

بل آف رائیٹس کے تحت امریکہ میں بہت آزادی تحریر و تقریر ہے۔ غیر مُلکی بعض اوقات اِس امر پر حیران ہوتے ہیں کہ امریکی اخبارات میں کِس شدت کے ساتھ صدر اور دوسرے افسران پر نکتہ چینی کی جاتی ہے۔ سرکاری افسران اپنے راز کے کھُل جانے، یا اخباروں میں ان پر حملے ہونے کے خوف کی بنا پر اپنے عہدہ کے اختیارات کا ناجائز استعمال نہیں کر پاتے۔ اگرچہ ازالہ عرفی کے قوانین موجُود ہیں۔ لیکن یہ اتنے سخت نہیں، جتنے کہ انگلستان میں ہیں۔ اور اس کے تحت مقدمہ جیت لینا بہت مشکل امر ہے۔

ریاست ہائے متحدہ میں یہ پیچیدہ سی حکومت کُلی طور پر مُکمل نہیں ہے جیسا کہ دوسرے مُلکوں میں دیکھا جاتا ہے۔ یہاں بھی امریکی کئی باتوں پر اعتراض کرتے ہیں۔ خاص طور پر اس وقت جبکہ ان کی پارٹی برسرِ اقتدار نہ ہو۔ بہت سی نکتہ چینی تو خود پارٹی کے طرزِ عمل پر ہوتی ہے۔

مبالغہ آمیز خطابت اور ڈرامائی انداز کے باوجُود انتخابات کی مہموں میں جو بہت شدید ہوتی ہیں، کئی اچھی باتیں رونما ہوتی ہیں۔ ان سے ووٹروں کو تربیت مِلتی ہے۔ امور واضح طور پر سامنے آتے ہیں۔ اور بہتری کیلئے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے، ان پر نظر جاتی ہے۔

اگرچہ امریکی اپنے مُلک اور اپنی ثقافت پر اعتراض کرتے ہیں۔ لیکن یہ نکتہ چینی انقلابی نہیں، بلکہ اصلاحی ہوتی ہے۔ بُنیادی تبدیلیوں کی جگہ صورتِ حالت کو بہتر بنانے کی تجویز پیش کی جاتی ہے۔ امریکیوں کی اکثریت امریکی طرزِ جمہوریت سے مطمئن ہے۔ یہ اُن کے مزاج کے مطابق نظر آتی ہے۔ اور اُن کے مُلک کیلئے بھی جو عام طور پر اس کے تحت پھلا پھُولا ہے۔ امریکی زیادہ سے زیادہ اِس خیال کو اپنا رہے ہیں، کہ اُنہیں اپنا مستقبل بنانے کیلئے دوسری قوموں کے ساتھ مِل کر قدم اُٹھانا چاہیئے۔

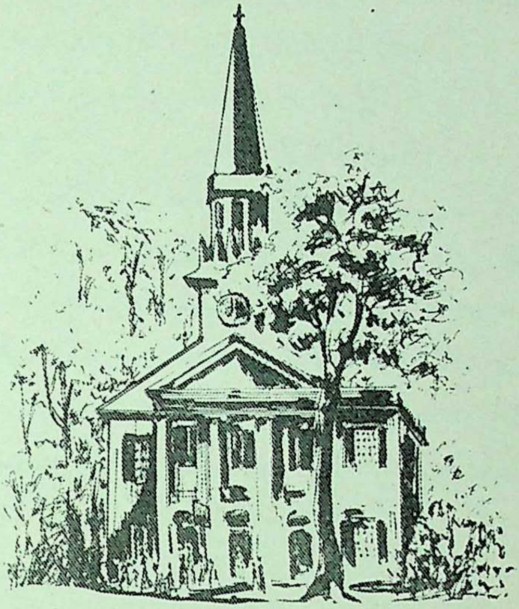

ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں مذہب

امریکہ میں جو کثرت کی بوقلمونی پائی جاتی ہے اُس کا کہیں بھی اِس قدر زیادہ ڈرامائی اظہار نہیں ہوتا۔ جس قدر کہ مذہب میں ہے۔ سنہ ۱۹۶۰ء میں ریاست ہائے متحدہ میں ۲۵۴ مختلف مذہبی جماعتیں یا گروہ تھے، جو بالکل با اختیار تھے۔ اور اپنے کاروبار کو خود ہی سنبھال رہے تھے۔ لیکن اس کثرت کے نیچے ایک مشترک نظریہ کارفرما ہے۔ بیشتر امریکیوں کا خیال ہے کہ مذہب اور جمہوریت ایک دوسرے کے نگہبان ہیں۔ وُہ انفرادی حقوق اور آزادیوں کو خُدا کی دین بتاتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ گرجا گھروں کو سیاست سے الگ تھلگ رہنا چاہیئے اور سیاستدانوں کو بھی مذہبی تنازعوں میں دخل انداز نہیں ہونا چاہیئے۔

گذُشتہ نصف صدی میں مذہب سے لگاؤ میں بہت زیادہ اضافہ ہُوا ہے۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں گرجا گھروں میں جن لوگوں کا اندراج تھا، وُہ آبادی کا ۴۳ فیصد بنتے تھے۔ لیکن ۱۹۶۰ء میں یہ تعداد ۶۳٫۴ فیصد ہو گئی تھی۔ لگ بھگ ۱۰ کروڑ امریکی ۳ لاکھ گرجا گھروں کے اجتماعوں میں شریک ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے مذہبوں کے نام لیواؤں کی تعداد کا تناسب اس نصف صدی میں لگ بھگ ایک سا ہی رہا ہے۔ ۱۹۶۰ء میں ۶۲۰ لاکھ سے زیادہ لوگ پروٹسٹنٹ تھے۔ لگ بھگ

۴۱۰ لاکھ رومن کیتھولک تھے۔ ۵۰ لاکھ یہودی تھے اور ایسٹرن آرتھوڈکس چرچوں کے ۳۰ لاکھ ممبر تھے۔ دوسرے اعتقادات جن کے نام لیوا امریکہ میں ملتے ہیں، یہ ہیں:- بدھ دھرم۔ اسلام۔ تھیوسافزم اور ویدانت۔

چونکہ سرکار چرچوں کو ٹیکسوں سے بالاتر قرار دینے کے علاوہ کوئی مالی امداد نہیں دیتی اس لئے یہ گرجا گھر کلی طور پر اپنے ممبروں کی مدد پر انحصار رکھتے ہیں۔ آئین کی پہلی ترمیم میں یہ کہا گیا ہے کہ "کانگرس کسی مذہبی ادارے کے بارے میں یا اسکی آزادانہ سرگرمیوں کو محدود کرنے کی غرض سے کوئی قانون نہیں بنائے گی"۔ جہاں تک سرکار کا تعلق ہے، امریکہ میں پرستش کرنیوالے لوگ اپنے گرجا گھروں کا کردار تبدیل کرنے یا نئے چرچ قائم کرنیکے سلسلے میں کلی طور پر آزاد ہیں۔

سرکاری ملازمت کیلئے کسی قسم کے مذہبی امتحانات نہیں لئے جاتے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ نسلی یا قبائلی امتیازات کے خلاف مہم کے پیشِ نظر بعض ریاستوں میں قانونی طور پر کسی ملازمت کے اُمیدوار یا کسی سکول میں داخلہ کے خواہش مند سے اُس کا مذہب پوچھنے کی مناہی کر دی گئی ہے۔

ذہنی طور پر ترقی یافتہ قارئین کیلئے جو کتابیں لکھی جاتی ہیں اور بعض ایسی کتابوں میں جو کچھ کالجوں میں پڑھائی جاتی ہیں۔ مذہبی، غیر مذہبی یا مذہب کے خلاف کھلے بندوں باتیں لکھی جا سکتی ہیں۔ لیکن سرکاری سکولوں۔ ریڈیو ٹیلی ویژن۔ رسالوں اور اخبارات وغیرہ قسم کے عوامی تفریح کے ذرائع کے ضمن میں اس امر کا خاص دھیان رکھا جاتا ہے کہ کسی مذہب کی دل آزاری کی کوئی بات نہ ہو۔

امریکی سیاست میں کیتھولک بہت اہم پارٹ ادا کرتے ہیں۔ اور وُہ کئی اعلیٰ سرکاری ملازمتوں پر فائز ہوئے ہیں (جس میں صدر کا عہدہ بھی ہے جس کیلئے ۱۹۶۰ئیں جان۔ ایف کینیڈی پہلے کیتھولک صدر چُنے گئے ہیں)۔ اِسی طرح اہلِ یہود بھی اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوتے رہتے ہیں۔ اوّل اوّل آنے والے لوگوں میں زیادہ تر پروٹسٹنٹ تھے جنہوں نے مُلک کو اپنا رنگ اور ڈھنگ دیا۔ اور اس کے اداروں کو قائم کیا۔ جرمنی اور سیکنڈے نیویا کے ممالک سے بعد میں آنیوالے پروٹسٹنٹ مہاجرین عام طور پر سیدھے زرعی خطوں کی طرف چلے جاتے رہے۔

آئرلینڈ۔ اٹلی اور وسطی یورپ سے آنیوالے کیتھولک مہاجرین زیادہ تر بڑے بڑے شہروں میں آباد ہوئے۔

امریکی جب اپنے مخصوص کلچر کا ذکر کرتے ہیں، تو وہ عام طور پر ان پیوریٹنوں کا ذکر ضرور کرتے ہیں جنہوں نے سترھویں صدی کے اوائل میں اِس امر کی ناکام کوشش کی تھی کہ چرچ آف انگلینڈ کو پہلی صدی عیسائیت کی پاکیزگی کے مطابق ڈھال دیا جائے۔ ۱۶۳۰ء کے بعد جب وُہ کثیر تعداد میں نیو انگلینڈ آئے۔ وہ ایک ایسی مذہبی ریاست قائم کرنا چاہتے تھے۔ جہاں کہ سختی کے ساتھ ایسے قوانین لاگو ہوں، جنہیں وُہ اپنے خیال کے مطابق خُدائی قوانین سمجھتے تھے۔

پیوریٹن اپنے آپ کو منتخب انسان سمجھتے تھے۔ جنہیں خدا ایک ایسے مُلک میں لے آیا ہے، جس کا اس نے وعدہ فرمایا تھا۔ وُہ بیک وقت صاحبِ عمل اور خُدا دوست تھے۔ اور یہ مانتے تھے کہ ان کی تقدیر پہلے سے طے کر دی گئی ہے۔ اس تصور نے اُنہیں خود اعتمادی کا بڑا جذبہ دے دیا تھا۔

پیوریٹن ازم نے امریکہ کو احساسِ مشن دیا۔ مقصد دیا اور ضمیر عطا کیا۔ انسان کو دُنیا میں اِس لئے وارد کیا گیا ہے کہ وُہ کام کرے۔ کوئی معرکہ مارے۔ اور "اپنے آپ کو کچھ بنائے"۔ مادی کامیابی خُدا کی برکت کی ایک نشانی ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کا صاف مطلب یہ بھی تھا کہ مادی کامیابی کے ثمرات کو محض اپنی مطلب براری کیلئے استعمال میں نہیں لایا جائے۔ اِسے خُدا کی امانت سمجھنا چاہیئے، جو دوسروں کے کام میں آئیں گے۔

اصلاحی یا اختلافی گروہ کے ممبروں نے بہت سی نو آبادیوں میں اخلاقی اور سماجی روایات قائم کرنے میں بہت اہم پارٹ ادا کیا ہے۔ پن سل وے نیا میں کوایکر Quaker کا بہت اثر و رسوخ تھا۔ چونکہ چرچ آف انگلینڈ سے سرکارِ برطانیہ کو منسوب کیا جانے لگا تھا۔ لہٰذا انقلاب کا یہ قدرتی نتیجہ نکلا۔ کہ چرچ اور ریاست دونوں کو الگ الگ کر دینے کا مطالبہ کیا گیا۔

انقلاب کے بعد مغرب میں جہاں آبادیاں بڑھ رہی تھیں بیپٹسٹ اور میتھاوڈلیسٹ گروہوں کا بہت عمل دخل رہا۔ انگلستان میں ان گروہوں کی اپیل محض ان تک ہوا کرتی تھی، جو یا تو غریب تھے، یا جائداد وغیرہ سے عاق شدہ۔ ان گروہوں کی تعلیم سادہ اور نہایت پیاری مصورانہ زبان میں ہوا کرتی تھی۔ اس کا انحصار زیادہ تر بائیبل کی بنیاد پر کی عیسائیت پر تھا۔ اور یہ ایسی سرحد کے عین مطابق تھی، جہاں کہ مذہبی لاپرواہی اور غیر آئینی حرکات شدید قسم کی ریاضت سے ہی بدلی جا سکتی تھیں۔ آزادی اور جوش کے اجتماع نے کئی نئے اعتقادات بھی پیدا کر دیئے — ایک خاتون میری بیکر ایڈی نے چرچ آف کرائسٹ سائنٹسٹ Church of Christ Scientist قائم کیا۔ جس سے اِس وقت دس لاکھ سے زیادہ ممبر ہیں۔ اور جو ریاست ہائے متحدہ امریکہ سے شائع ہونے والے بہترین اخبارات میں گِنا جانے والا ایک اخبار بوسٹن سے نکالتے ہیں۔ ورمونٹ کے جوزف سمتھ نے ایک کتاب ‘مورمون’ لکھی۔ جو اس کے قول کے مطابق ان طلائی تختیوں سے نقل کی گئی تھی، جن کا الہام اسے ایک فرشتہ نے کیا تھا۔ یہ کتاب ایک گروہ کے لئے بائیبل بن گئی۔

اور اس گروہ کی تعداد میں جیسے جیسے کہ وہ اوہائیو سے میسوری اور وہاں سے اِلی نوئے منتقل ہوتا گیا، اضافہ ہوتا گیا۔ اکثر اوقات ان کے خلاف تشدد کیا جاتا اور انہیں مار بھگایا جاتا تھا۔ کیونکہ لوگوں کو ان کی کثرتِ ازدواج کی بات پسند نہ تھی۔ بالآخر اوٹاہ میں جہاں کہ گریٹ سالٹ لیک کی زرخیز وادی بے آباد پڑی تھی، اس گروہ نے ایک بستی بنائی۔ جو خوب پھل پھول نکلی۔ اور اس علاقہ میں یہی مذہب اب بھی اہم ترین ہے۔ اگرچہ اس کے نام لیوا اب کثرتِ ازدواج کے اصول کو ترک کر چکے ہیں۔

امریکہ میں مذہب ہمیشہ سماجی لہروں کے مطابق عمل پیرا ہوتا رہا ہے۔ بلکہ اس پر یہ اعتراض آتا رہا ہے کہ وہ امریکی رجائیت پسندی اور آزاد خیالی کے مطابق بدلتا رہا ہے۔

لیکن دوسری جنگِ عظیم کے تباہ کن تجربات کے بعد اور بین الاقوامی تناؤ کے اِس دور میں جو کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ امریکہ میں مذہبی نظریوں میں بہت تبدیلی آگئی ہے اور وہ بہت گہرے ہو گئے ہیں۔ مشہور عالم۔ عالمِ دین رین ہولڈ نیبہر Reinhold Niebuhr اور پال ٹی لِچ Paul Tillich کی رہنمائی میں کالج کے طلباء پادری اور عوام کے اکثر گروہ اب مذہبی حقائق کو زیادہ سنجیدگی سے دیکھنے لگے ہیں۔ وہ اب خود اعتمادی اور سہل رجائیت سے دُور ہٹ رہے ہیں۔ اب انہیں زندگی کے المناک عنصر سے دِلچسپی پیدا ہو رہی ہے۔ اور وہ سمجھ گئے ہیں۔ کہ کسی برحق اخلاقی مقام کو حاصل کرنے کیلئے انسان کو اپنے اعمال پر کِس قدر نکتہ چینی کرنی چاہیئے۔ اور یہ کام کِس قدر پیچیدہ ہوتا ہے۔

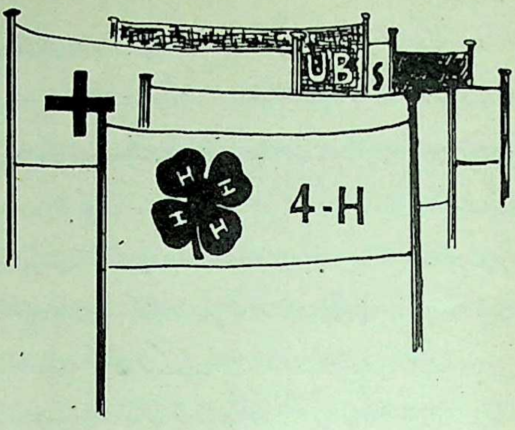

ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں رضا کار جماعتیں

امریکہ میں کئی قسم کی رضا کار جماعتیں پھل پھول رہی ہیں اور جمہوری طرزِ حکومت کی نشو ونما میں معاون ثابت ہو رہی ہیں۔ ان میں چرچ کی حیثیت اس کی اپنی اہمیت کے باوجود محض ایک رضا کار انجمن کی ہے۔ رضا کار سے ہماری مراد ایسی تنظیموں سے ہے، جو سرکار کے حلقۂ اثر سے آزاد ہیں۔ جو نفع نہیں کماتیں اور جن کے وہ لوگ ممبر بن سکتے ہیں، جو اُس کے اہل ہیں۔ علاوہ ازیں جو لوگ نہ چاہیں، ان سے الگ رہیں۔

اپنی سرکار پر، امریکی لوگ ووٹنگ اور اپنے نمائندوں سے عرض معروض کر کے اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ وہ مختلف قسم کی رضا کار جماعتوں میں اپنی سرگرمیوں کے ذریعہ بھی حکومت اور عوامی رائے پر اثر ڈال سکتے ہیں۔ یہ رضا کار جماعتیں سرکار اور افراد میں ایک درمیانی منزل کا کام دیتی ہیں۔ یہ جمہوریت میں جمہوریتیں ہوتی ہیں۔

امریکہ میں جو شخص آپ کی ڈاک تقسیم کرتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی برادری یا انجمن میں کوئی بڑا عہدہ دار ہو۔ آپکے محبوب ریسٹورنٹ میں جو شخص آپ کی خدمت پر مامور ہے، ہو سکتا ہے کہ وہ مچھیروں کے کلب یا اینگلو امریکن سوسائٹی کا سیکرٹری ہو۔ والدین استادوں اور والدین کی انجمنوں کے ممبر ہوتے ہیں، جو ایک مہینہ میں ایک بار سکولوں میں ملتے ہیں۔ آپ کے ساتھیوں یا پروفیسروں کی بیویاں ہو سکتی ہیں کہ ڈاٹرز آف دی امریکن ریولوشن یا لیگ آف وومن ووٹرز کی ممبر ہوں۔ آپ کے ڈاکٹر اور دندان ساز تو بالعموم اپنی پیشہ ور سوسائیٹوں کے ممبر ہوں گے۔ لیکن ہو سکتا ہے — کہ وہ غیر پیشہ ور مصوروں اور موسیقاروں کی انجمنوں کے بھی ممبر ہوں۔

سٹوروں اور بنکوں میں جن لوگوں سے آپ کا واسطہ پڑتا ہے۔ وہ چیمبرز آف کامرس روٹری۔ کی وانس کلب یا دی لائینز کلب کے ممبر ہو سکتے ہیں۔ اکثر شہروں میں گارڈن کلب ہیں۔ کالج اور یونیورسٹی کے عالموں کی بھی تنظیمیں ہیں۔ اسی طرح ٹکٹ اکٹھی کرنے والوں۔ کُتے پالنے والوں۔ مارک ٹوین کے مداحوں اور سزائے موت کے خلاف آواز اُٹھانے والوں کی بھی انجمنیں ہیں۔ جب تک کسی جرم کی بھاؤنا پیدا نہیں ہوتی۔ ہر امریکی اپنی مرضی کے مطابق کوئی انجمن بنا سکتا ہے۔ یا

کسی انجمن کا بلا روک ٹوک ممبر بن سکتا ہے۔ ان انجمنوں کو بھی افراد کی طرح حکومت کے سامنے اپیل کرنے یا عوام کے سامنے بیان دینے کا ادھیکار ہے۔ جس طرح کہ تقریباً ہر مذہبی گروہ کا اپنا کوئی رسالہ یا اخبار ہوتا ہے۔ اسی طرح مقامی یا قومی نوعیت کی اکثر انجمنوں کی بھی اپنی ہی کچھ اشاعتیں ہیں۔ اکثر اوقات یہ نہایت دیدہ زیب اور مصور قسم کے ماہنامے ہوتے ہیں۔

رضاکار جماعتیں ذمہ داریوں خدمت گزاریوں اور اپنی پہچان کے ایسے مواقع فراہم کرتی ہیں، جو ایک انسان اپنی باقاعدہ ملازمت میں شاید حاصل نہ کر سکے۔ زیادہ تر ان انجمنوں کے ممبروں کے ایک سے پسِ منظر۔ مزاج اور مفاد ہوتے ہیں۔ وُہ انسان کی انفرادیت کی نشو ونما، اور اس کی مخصوص صلاحیت کو پھلنے پھُولنے میں مدد دیتے ہیں۔ وُہ سب کو ایک ہی رنگ میں رنگنے کی کوشش نہیں کرتے۔ بلکہ وُہ عوامی مطابقت سے نقص کو دُور کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

مقبولِ عام رضاکار جماعتوں میں جنہیں سیوا دَل کہا جاتا ہے۔ روٹری۔ کی وانس اور لائنز ایسے کلب ہیں۔ یہ لوگ رفاہ عامہ کی سرگرمیاں انجام دیتے ہیں۔ اپنے ممبروں کیلئے نہیں بلکہ ان لوگوں کے لئے جہاں کہ یہ رہتے ہوں۔ مثلاً اپنے شہر میں صحت عامہ کی بہتری کیلئے کام کریں گے۔ عوامی تفریح کی سہولتوں کو بہتر بنا دیں گے۔ مقامی طلبا کو مقامی سکولوں میں، اور غیر مُلکی طلبا کو جو اُن کے ہاں پڑھنے آتے ہیں، وظائف دیں گے۔

امریکہ کے اکثر بڑے اور چھوٹے شہروں میں ہر سال “کمیونٹی چسٹ ڈرائیو” کے نام سے چندہ اکٹھا کیا جاتا ہے، جو مقامی رفاہ عام کے کاموں۔ ہسپتالوں۔ موسم گرما کیلئے بنائے گئے کھیل کے میدانوں اور جوانوں کی انجمنوں پر، جن میں وائی ایم سی اے، وائی ڈبلیو سی اے بھی ہوتی ہیں۔ خرچ کیا جاتا ہے۔ رضاکار گروہوں کی شکل میں عوام سے چندہ وصول کرنے کی غرض سے نکلتے ہیں۔ امریکہ میں کوئی نہ کوئی ایسی انجمن ضرور نکل آتی ہے۔ جو کسی شخص کی تکلیف میں اس کی امداد کر سکے۔ ریاستیں اور مرکز بے روزگاری کی انشورنس۔ پنشن اور بڑھاپے کی امداد کی شکل میں جو فراخدلانہ امداد دی جا رہی ہے۔ اس سے رضاکارانہ کارِ خیر کو بہت مدد ملتی ہے۔ ہر طبقے میں اکثر عورتیں رضاکارانہ طور پر کارِ خیر کی انجمنوں اور ہسپتالوں میں اپنا وقت صرف کرتی ہیں۔

سرکردہ شہری پرائیویٹ سکولوں اور کالجوں کے انتظامیہ بورڈ کے ممبر ہوتے ہیں۔ یہ لوگ عوام کی بہبود کا جذبہ رکھتے ہیں۔ اگرچہ سرکردہ تاجروں اور پیشہ ور لوگوں کو سیاست میں لانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ تاہم ان میں سے اکثر یہ اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ وُہ رضاکارانہ جماعتوں کو اپنا تعاون دیں۔

امریکہ کی یہ بھی ایک خصوصیت ہے کہ وہاں ایسی انجمنیں بھی ہیں۔ جن کا کوئی مشترک قومی نسلی یا لسانی پسِ منظر ہوتا ہے۔ قومی انجمنوں کی فہرست سے اگر بلا کسی خاص غور کے آپ نام لینا شروع کر دیں تو آپ کو ایسی سینکڑوں انجمنیں مِل جائیں گی۔ مثلاً دی امریکن لٹوین ایسوسی ایشن۔ دی امریکن سویڈیش ہسٹاریکل فاؤنڈیشن۔ دی چائنز ومنز ایسوسی ایشن۔ دی اٹیلین امریکن ورلڈ وار ویٹرنز۔ دی پولش نیشنل الائینس۔ دی زنوالیسٹ آرگنائیزیشن آف امریکہ

ان انجمنوں نے دوگونہ مقصد سرانجام دیا۔ انہوں نے اپنے آبائی گھر کی روایات کو محفوظ رکھنے میں مدد دی۔ گویا کہ امریکہ میں آنے کا یہ مطلب نہ تھا کہ ماضی سے قطعی طور پر روحانی رشتہ توڑ لینے کا دُکھ سہنا پڑے۔ ساتھ ساتھ ہی ان انجمنوں نے تارکانِ وطن کو امریکی بنانے کے عمل کو آسان بنایا۔ اور نئی دُنیا میں ان کی ترقی کے راستے میں جس قدر پریشانیاں آسکتی تھیں، اُن کو دُور کرنے میں مدد دی۔

۱۹۱۵ء میں جبکہ امریکہ میں آنے والوں کی تعداد اپنے عروج کو پہنچ گئی تھی، سابق صدر تھیوڈور روزویلٹ نے "نائیٹس آف کولمبس" کے روبرو جو کہ رومن کیتھولک کے عوام کی برادری تھی، تقریر کرتے ہوئے کہا "اس ملک میں نشانِ الحاق لگانے والے امریکی کیلئے کوئی جگہ نہیں"۔ نشانِ الحاق کا اشارہ اس قسم کے لوگوں کی طرف تھا جو خود کو "پولش - امریکن" یا "جرمن امریکن" کہتے تھے۔ جس سے شک یہ رہتا تھا کہ ان کی وفاداریاں منقسم ہیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ "اس قوم کو تباہ کر دینے اور اس کے واحد مضبوط قوم کے امکانات کو ختم کرنے کا ایک یقینی طریقہ یہ ہے کہ اسے متصادم قوموں کا ایک جمگھٹا بننے کی اجازت دے دی جائے۔"

لیکن نیگروؤں کی سرکردہ انجمن "دی نیشنل ایسوسی ایشن فار دی ایڈوانسمنٹ آف کلرڈ پیپل" کا کردار کچھ اور ہے۔ اور امریکی نیگرو کا اپنے افریقی ماضی سے بہت کم رشتہ باقی رہ گیا ہے۔ یہ انجمن نیگروؤں کو امتیازی سلوک سے بچانے کے لئے نہایت سرگرمی سے کام کرتی ہے۔

دوسری کئی قسم کی انجمنوں کا بہ تفصیل ذکر کرنا غیر ضروری ہوگا، چونکہ یہ دوسرے ملکوں کی ایسی ہی انجمنوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ جن انجمنوں کا یہاں ذکر کیا گیا ہے۔ چونکہ وہ سبھی خود مختار ہیں۔ لہذا ان کی ریاستی یا قومی کنونشنز ہوتی ہیں جہاں کہ عہدیداروں کا چناؤ ہوتا ہے۔ پالیسیاں طے کی جاتی ہیں۔ سیاست۔ ثقافت۔ کھیل۔ تجارت اور دوسرے مخصوص پیشوں میں جو جدید تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں، ان کا پتہ چلتا ہے۔ اور ایک سے مزاج کے لوگ مل کر کچھ اچھا وقت بسر کرتے ہیں۔

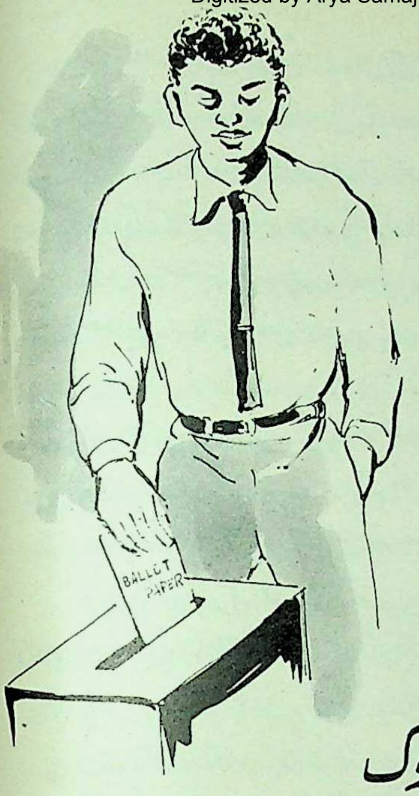

مختلف طبقوں اور اقلیتوں سے سلوک

ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں نیگروؤں کے ساتھ جو سلوک ہوتا ہے۔ اُس کا اگر بیرون ممالک میں اسقدر ذکر آتا ہے تو اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ امریکی خود اس ضمن میں بہت صاف دِل رہے ہیں۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں نسلی امتیاز کی بنا پر جس قدر واقعات رونما ہوتے ہیں، امریکی اخبار اس کا مکمل ڈرامائی ذکر کرتے ہیں اور امتیاز ختم کرنے کے بارے میں جو بتدریج کامیابی ہو رہی ہے، اس کا بہت کم ذکر کیا جاتا ہے۔

جمہوریت اور نیگرو کے مسائل پر سب سے عمدہ کتاب ایک سویڈش ماہرِ اقتصادیات گنار مِرڈل نے لِکھی تھی۔ اس کا نام ہے: "امریکہ کی ایک پریشانی"

An American Dilemma

اِس کتاب میں موصوف لِکھتے ہیں کہ "امریکی اپنی غلطیوں کا جائزہ لیتا ہے۔ ان کو ضبطِ تحریر میں لاتا ہے اور پھر چھت پر سے ان کو نشر کرتا ہے۔ نیگروؤں کے ساتھ امریکہ میں جو سلوک ہو رہا ہے۔ اس کے خلاف خود سفید فام امریکیوں نے شدید نکتہ چینی کی ہے۔ اور یہ بات انقلاب سے بہت پہلے سے ہو رہی ہے۔ اور اس میں اس وقت تک شدت پیدا ہوتی جائے گی، جب تک کہ امریکہ میں قطعی طور پر سُدھار نہیں ہو جاتا۔"

لیکن اس کی کیا وجہ ہے کہ اس اصلاح کے ہونے میں اِس قدر مدت صَرف ہو گئی ہے؟ اعلانِ آزادی میں تمام انسانوں کے اٹل حقوق کا ذکر کیا گیا تھا۔ نیگرو امریکہ کے ضمیر پر گُزشتہ دو صدیوں سے سوار ہیں۔ اِس سِلسلہ میں جو آہستہ آہستہ پیشقدمی ہو رہی ہے اس کی ایک وجہ اقتصادی ہے اور دوسری سیاسی۔

اوّلین آباد کاروں نے اندازہ لگایا تھا۔ کہ جنوب کی زرخیز زمین میں دولت کی فراوانی ہے۔ اس زمانے میں جبکہ دُنیا کے اکثر مُلکوں میں غلاموں کی تجارت ہوتی تھی۔ افریقہ سے غلام درآمد کئے جاتے تھے۔ چونکہ یہ تمازتِ آفتاب میں اچھی طرح کام کر سکتے تھے۔ ۱۷۱۵ء تک ۳۰ ہزار غلام درآمد کئے جا چکے تھے۔ ۱۷۹۰ء میں نیگرو کی آبادی ملک کی کل آبادی کا ۱/۵ حِصّہ تھی۔ ۱۸۰۸ء تک جبکہ غلاموں کی تجارت لگ بھگ بند کر دی گئی تھی، تقریباً ۳ لاکھ ۳۰ ہزار نیگرو درآمد کئے گئے اور ۱۸۰۸ء سے لیکر خانہ جنگی تک کے درمیانی عرصے میں غالباً اسی قدر اور نیگرو چوری چھُپے لائے گئے۔

آغاز سے ہی امریکہ کے خُداداد قدرتی حقوق کے اصولوں سے غلامی کوئی مطابقت کھاتی نظر نہیں آتی تھی۔ جنوبی ریاستوں کے بہت سے لوگ جنہوں نے جمہوریت کی بُنیادیں اُٹھانے میں حِصہ لیا تھا، غلامی کو ناپسند کرتے تھے اور توقع کرتے تھے کہ مستقبل میں یہ ختم ہو جائے گی۔ خانہ جنگی سے قبل جنوب میں پندرہ میں سے تقریباً ایک کے پاس غلام تھا۔ بہت سے لوگ یہ خیال کرتے تھے کہ غلام کام چور ہیں اور غلامی گُناہ ہے۔

لیکن کسی نہ کسی طریقہ سے بڑے بڑے فارموں کے مالکان نے سیاسی اقتدار حاصل کر لیا۔ غلامی جسے "عجیب دستور" کا نام دیا جاتا تھا۔ جنوب کے کلچر کا ایک جزوِ لازم بن گئی۔ اس رواج کی ریاستیں قوانین بنا کر حفاظت کرنے لگیں اور اولڈ ٹسٹامنٹ (بائیبل قدیم) اور یونانِ قدیم کی جمہوریتوں کے حوالوں سے جہاں کہ غلامی کا دستور تھا اس کو حق بجانب قرار دینے کیلئے طویل نسلی تھیوریاں پیش کی جانے لگیں۔ جنوب کے صحافیوں نے نام نہاد قسم کی سائنسی دلیلوں سے اس بات کی وضاحت کرنے کی کوشش کی کہ حیاتی طور پر نیگروؤں میں ایسی خاصیتیں پائی جاتی ہیں جو انہیں سماجی ذمہ داریوں کے نااہل بنا دیتی ہیں۔

شمال کے رُوئی کے کارخانوں کا انحصار اقتصادی طور پر جنوب کی کپاس پر تھا۔ اِس لئے نیو انگلینڈ کے اکثر سرکردہ اشخاص جنوب میں پائی جانیوالی غلامی کو برداشت کرنے پر رضامند تھے۔ ۱۸۴۰ء سے ۱۸۵۰ء کے درمیان انسدادِ غلامی کے حامیوں کو لوگوں نے بوسٹن کی گلیوں میں گھیر لیا تھا۔ نیو انگلینڈ کے سرکردہ مصنفین غلامی کے سخت خلاف تھے۔ لیکن اُنہوں نے اس بات پر وچار نہیں کیا تھا۔ کہ اگر یکایک انسدادِ غلامی کر دیا گیا تو جنوب میں سماجی اور اقتصادی طور پر کیا انقلاب آئے گا۔

شکل و صورت اور مقام و درجہ کے اعتبار سے افریقی غلام نیگرو اور شمالی یورپ کے سفید فام میں اِسقدر بڑا فرق پایا جاتا تھا۔ کہ نیگرو بجائے ایک الگ جماعت کے ایک الگ ذات بن گئی اور یہ ذات پیدائشی تھی۔ جنوب میں جس کسی کا بھی نیگرو خون ہوتا چاہے وہ کِتنا ہی تھوڑا کیوں نہ ہو۔ اسے نیگرو سمجھا جاتا تھا۔

۱۸۵۰ء سے ۱۸۶۰ء کے درمیان شمال میں انسدادِ غلامی کے جذبہ کو کچھ تو "انکل ٹومز کیبن" ایسی کتابوں سے اور کچھ اس جھگڑے سے جو مغربی علاقوں میں غلامی کو رائج کرنے پر شروع ہوا تھا، تقویت ملی۔ خانہ جنگی کے تیسرے سال ابراہیم لنکن نے تمام غلاموں کے آزاد ہونے کا حکم دیا۔ اور فتح کے بعد مرکزی سرکار نے جنوبی ریاستوں میں تعمیرِ نو کی سرکاریں قائم کیں۔ جن میں آزاد شُدہ نیگروؤں نے بہت اہم کام کیا — آزاد انسانوں کے بیورو بنائے گئے، جو سابقہ غلاموں کی دیکھ بھال کرتے تھے اور انہیں ایسی زمینیں الاٹ کرتے تھے، جو یا تو ضبط کر لی گئی تھیں، یا جن کے مالکان انہیں چھوڑ گئے تھے۔

۱۸۶۸ء میں آئین کی ۱۴ ویں ترمیم منظور کی گئی۔ اس کے ذریعہ نئے آزاد ہونے والے غلاموں کے حقوق کی حفاظت کرنا مقصود تھا۔ ۱۸۷۷ء سے لیکر ۱۹۳۰ء کے کچھ برس بعد تک خود سپریم کورٹ نے یہ فیصلے دیئے تھے کہ نسلی امتیازات بہت حد تک جائز ہیں۔ ۱۴ ویں ترمیم کا یہ مطلب لیتے ہوئے کہ اس کا تعلق مرکزی سرکار اور کسی شہری کے حقوق سے ہے۔ سپریم کورٹ نے جنوبی ریاستوں کو اجازت دی کہ وہ سکولوں۔ تفریح گاہوں۔ ریلوں اور بسوں وغیرہ میں نیگرو اور سفید فام کو الگ الگ کر سکتی ہیں۔ ۱۸۹۶ء میں کورٹ نے فیصلہ دیا کہ ۱۴ ویں ترمیم "دونوں نسلوں کو قانون کے روبرو مکمل مساوات" کا یقین دلاتی ہے۔ لیکن اس سے مراد یہ نہیں کہ "رنگ کی بنیاد پر قائم اختلافات کو ختم کر دیا جائے' یا سماجی ایکتا جو کہ سیاسی مساوات سے الگ چیز ہے' نافذ کر دی جائے۔"

اس فیصلے نے "علیحدہ لیکن مساوی" اصول کے مطابق جو نہ صرف جنوب بلکہ قومی فوجوں اور مرکزی ملازمتوں میں رائج تھا، علیحدگی کو قانونی طور پر جائز بنا دیا' جو ماضی قریب تک جاری رہا۔

گزشتہ بیس برس میں صورت حالات میں بتدریج بہتری ہوئی ہے۔ اسکی وجوہات یہ ہیں کہ اقتصادی اور سماجی حالات بہتر ہو گئے ہیں۔ عوام بہت زیادہ لکھ پڑھ گئے ہیں۔ نیز نیگروؤں اور ان کے دوستوں نے قانونی چارہ جوئیاں کیں اور انکی تنظیمیں مؤثر ثابت ہوئی ہیں۔ جنوب میں بائیکاٹ اور قانونی چارہ جوئی نے ریل گاڑیوں اور بسوں پر سے علیحدگی (نسلی امتیاز) کو ختم کرنے میں مدد دی ہے۔

مسلح فوجوں کی تمام شاخوں نے نسلی امتیاز ختم کرنیکی پالیسیاں اپنا لی ہیں۔ نیگروؤں کو بھی سفید فاموں کی طرح خاص قسم کے فوجی سکولوں میں تربیت کے لئے بھیجا جاتا ہے۔ اور ان کو بھی افسروں کے عہدے دیئے جاتے ہیں۔

۱۹۴۱ء میں صدر فرینکلن ڈی روزویلٹ نے فیئر ایمپلائمنٹ پریکٹس کمیٹی Fair Employment Practices Committee بنائی۔ تاکہ کام تفویض کرنے میں نسلی امتیاز ختم کیا جائے۔ بہت سی ریاستوں نے فیڈرل سرکار کے مطابق عمل کیا اور ملازمت کے جائز طریقوں کو زیر عمل لانے کیلئے قوانین بنائے جن کے ذریعہ نسل۔ مذہب یا رنگ کی بنا پر کسی قسم کا امتیاز برتنا غیر ضروری قرار دے دیا گیا۔ سکولوں۔ کالجوں۔ ہوٹلوں اور موسم گرما کی تفریح گاہوں میں آنے والوں کی درخواستوں کو محض نسل کی بنا پر مسترد کرنے کی مناہی کر دی گئی۔

۱۹۴۰ء سے اب تک نیگرو کی مالی پوزیشن میں جو بہتری رونما ہوئی ہے۔ اس کا پتہ یو ایس نیوز اینڈ ورلڈ رپورٹ U.S. and World Report کے اعداد و شمار سے چلتا ہے۔ ۱۹۵۸ء میں امریکہ کے کالجوں یا پیشہ وارانہ سکولوں میں ۲۲۰۰۰۰ نیگرو تھے۔ اور اب امریکی ٹریڈ یونینوں میں ۲۵ لاکھ نیگرو ہیں' جبکہ ۱۹۳۸ء میں یہ صرف ۷½ لاکھ تھے۔

جنوب سے باہر بھی جہاں تک مکانوں کا تعلق ہے نسلی امتیاز تا حال ایک مسئلہ بنا ہوا ہے۔ کچھ مالکان مکانات اور جائدادوں کی خرید و فروخت کرنے والوں کا یہ خیال ہے کہ اگر سفید فاموں کے ہمسایہ میں نیگرو چلے آئیں تو ان مکانات کی قیمتیں گر جاتی ہیں۔ بعض اوقات نیگرو فیملی کو جو سفید فاموں کے ہمسایہ میں آنا چاہتی ہو' دھمکایا جاتا ہے اور ان کے خلاف ہجوم تشدد بھی کر دیتا ہے۔ لیکن ایسی تمام وارداتوں میں اکثر لوگ ان نیگروؤں کی حمایت کرتے ہیں اور نیگرو ان نئے مکانات میں رہ جاتے ہیں۔ عام طور پر ان لاتعداد واقعات کا ذکر نہیں کیا جاتا جبکہ نیگروؤں کو بلا کسی روک ٹوک

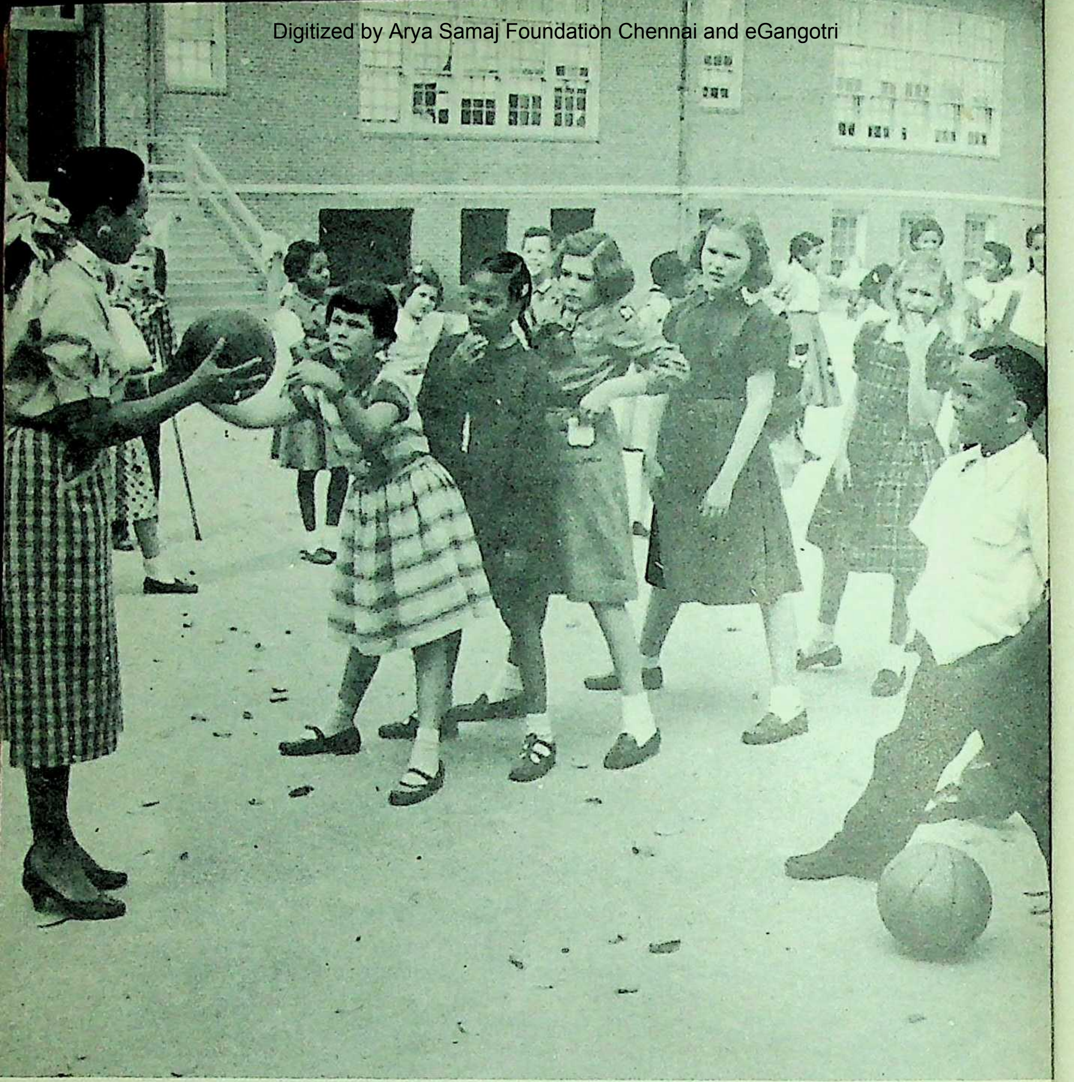

امریکہ میں نسلی اتحاد کے فروغ کے ساتھ ساتھ گورے اور نیگرو بچے اکھٹے کھیل رہے ہیں

کے رہنے دیا گیا ہو۔ بطور کرایہ دار اور مالکانِ مکان کے نیگرو اب سفید فاموں کے ساتھ مساوی بنیاد پر کھُل مِل رہے ہیں۔

جنوب میں خاص طور پر شہروں میں اب زیادہ تعداد میں نیگرو اپنے ووٹ کے حق کو استعمال کرتے ہیں۔ گزشتہ دس برس میں جنوبی ریاستوں میں رجسٹرڈ نیگرو ووٹروں کی تعداد میں سرعت کے ساتھ اضافہ ہوا ہے۔ جیسے جیسے جنوبی ریاستوں کے سیاستدانوں کو اِس امر کا احساس ہو گا کہ انتخابات میں ان کی کامیابی یا ناکامی کا انحصار نیگروؤں کی حمایت یا مخالفت پر منحصر ہے۔ وہ مقامی اور ریاستی انتظامات میں اُن سے مساویانہ سلوک کرنے لگیں گے۔

خانہ جنگی سے لیکر اب تک نیگروؤں کو مساوی حقوق دینے کیلئے جو جدوجہد ہوتی آرہی ہے۔ اس میں سپریم کورٹ کے ۱۷ مئی سنہ ۱۹۵۴ء کے متفقہ فیصلے سے کوئی بھی زیادہ اہم واقعہ رونما نہیں ہوا ہو گا۔ کورٹ نے اس روز اعلان کیا کہ "ہم آج کے روز یہ فیصلہ دیتے ہیں کہ ۱۴ویں ترمیم کی مساوی حفاظت کی دفعہ ریاستوں کو نسلی امتیاز کے الگ الگ سکول قائم کرنے سے

منع کرتی ہے"۔ پانچ مختلف علاقوں سے نیگروؤں نے سپریم کورٹ کے سامنے سکول بورڈوں کے خلاف یہ اپیل کی تھی کہ انہیں کہا جاتا ہے کہ وہ نسلی امتیاز کی بنا پر علیحدہ قائم شدہ سکولوں میں اپنے بچے بھیجیں۔ کورٹ نے فیصلہ دیتے ہوئے کہا "پبلک تعلیم" کے میدان میں الگ مگر مساوی اصول کیلئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ تعلیم کی الگ الگ سہولتیں دینا بنیادی طور پر مساوی نہیں ہو سکتا"۔ ریاستوں اور مقامی مدرسوں سے کہا گیا کہ وہ بہ تمام تیزی نسلی علیحدگی کو دور کرنے کی غرض سے اقدام کریں۔

مشترکہ سکولوں کے حامیوں کا خیال تھا کہ جیسے جیسے طالب علم بڑے ہو کر ماضی کو بھول جائیں گے، یا وہ قدیم تعصبات سے دوچار ہی نہ ہوں گے، تو ان کے درمیان سے نسلی امتیاز اُٹھ جائیگا۔ عدالت کے فیصلے کو زیرِ عمل نہ لانے کے کچھ واقعات بھی روشنی میں آئے ہیں اور اخبارات نے ان وارداتوں کو بہ تفصیل بیان کیا ہے۔ لیکن جنوب میں کئی طبقوں نے سکولوں اور سرکاری بسوں اور ریلوں وغیرہ پر سے نسلی امتیاز کو جس پُرامن اور اطمینان بخش طریقہ سے دُور کر دیا ہے۔ اُس کا بہت کم ذکر ہُوا ہے۔

نسلی مساوات کی طرف اگر آہستہ روی سے قدم بڑھا ہے تو اسکی وجہ یہ امریکی اصول ہے کہ ہر تبدیلی عوام کی مرضی اور سمجھ سے ہونی چاہیئے۔ امریکہ میں وہ قانون عام طور پر زیر عمل نہیں آتے، جن کو عوام کی حمایت حاصل نہ ہو۔ جنوب میں سماجی مساوات ۱۸۶۵ء سے ۱۸۷۷ء کے درمیان ایک حملہ آور فوج نے ٹھونسی تھی۔ لیکن اس سے نفرت پیدا ہوئی اور "سفید فام" مقابلہ میں متحد ہو گئے۔ حالیہ برسوں میں امریکہ کے ہر حصّہ میں گہری تعلیم کا سلسلہ شروع ہُوا ہے۔ اسی عوامی تعلیم نے عدالتوں کے فیصلوں اور عالمی واقعات سے پیدا شدہ اسباق سے مِل کر دُور رس تبدیلیاں کی ہیں۔

لیکن اِس سے قبل کہ نیگروؤں کو مکمل تعلیمی، اقتصادی اور سماجی مساوات میسر آ سکے، بہت کچھ کرنا ہوگا۔ اور یہ وہ حقیقت ہے، جو مُلک کے ہر حصّے میں نظر آتی ہے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں رنگ کی بنا پر تعصبات کے جو کچھ نشان بچ رہے ہیں، وہ نسلی امتیازات سے زیادہ کلچرل نوعیت کے ہیں۔ اور تارکانِ وطن کے ایک کے بعد دوسرے ریلوں کے پیدا کردہ ہیں۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں اوّل اوّل آباد ہونے والوں میں اکثر شمالی یورپ سے آئے تھے۔ ان کا ثقافتی پس منظر جو کہ نچلے متوسط طبقہ، اور پروٹسٹنٹ عقیدے کا تھا۔ افریقی غلاموں سے بالکل مختلف تھا۔ امریکہ میں اکثر آبادی کی زبان انگریزی تھی اور اس کی سیاسی اور کلچرل روایات زیادہ تر انگریزی تھیں۔ سیکنڈے نیویا کے ممالک اور جرمنی سے آنیوالے پروٹسٹنٹ لوگوں سے یہ بہت مِلتے جلتے تھے۔ انیسویں صدی کے آغاز میں بہت سے آئرش لوگ آ گئے۔ خاص طور پر نیو انگلینڈ اور نیو یارک میں۔ یہ تھے تو کیتھولک لیکن ان کو ایک فائدہ تھا کہ یہ انگریزی زبان بولتے تھے۔ ۱۸۸۰ء کے بعد سے جو تارکانِ وطن آئے، وہ زیادہ تر وسطی اور جنوبی یورپ سے آئے اور ان کا پس منظر زیادہ تر دیہاتی تھا۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد لوگوں کی امریکہ میں آمد پر سخت پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ حال ہی میں جو زیادہ تارکانِ وطن آئے ہیں، وہ پیورٹو ریکا اور ایسے مُلکوں سے آئے ہیں، جہاں کہ عامرانہ حکومتیں قائم ہیں۔

اوّلین آباد کاروں کو اِس بات کا بہت فائدہ رہا کہ انہوں نے جو کلچر امریکہ میں قائم کیا۔ وہ اُن کے اپنے ثقافتی ورثے کے مطابق تھا۔ اور وہ پہلے ریلے میں امریکہ پہنچ گئے تھے۔ بہت دنوں کی بات نہیں۔ ان اوّلین آباد کاروں کے وارثین سیاہ فام لوگوں یا پولش۔ جیوش اور لاطینی نام والے بعد میں آنیوالے آباد کاروں کے مقابلہ میں خود کو "اصلی امریکی"

سمجھا کرتے تھے۔ خود نیگروؤں میں وہ نیگرو جن کا رنگ کم سیاہ ہے۔ مقابلتاً اچھی سماجی پوزیشن میں ہیں لیکن اب نقشہ بدل گیا ہے اور آبادی میں جس قدر رنگ رُوپ پائے جاتے ہیں، سب تیزی کے ساتھ برابر برابر ہو رہے ہیں۔ اور آپس میں گھُل مِل رہے ہیں۔

نیگروؤں کے علاوہ بھی عوامی تعلیم اور بدلتے ہوئے سماجی اور اقتصادی حالات پُرانے تعصبات کو ختم کر رہے ہیں۔ ماضی میں سامی نسل کے خلاف امریکہ میں شدید جذبہ پایا جاتا تھا۔ بہت سے ہوٹلوں اور کئی ایک سماجی کلبوں میں یہودیوں کا سواگت نہیں ہوتا تھا۔ اور کچھ اعلیٰ کالجوں اور میڈیکل سکولوں میں ان کے داخلہ پر بلا اعلان کئے ہوئے پابندیاں عائد تھیں جن کے تحت وُہ ایک خاص تعداد سے زیادہ نشستیں نہیں لے سکتے تھے۔ لیکن اب اکثر حلقوں میں نسلی امتیاز کے اظہار یا کسی قوم کے خلاف کوئی بات کہنے پر سخت ناراضگی دکھائی جاتی ہے۔

امریکہ کے اکثر بڑے شہروں میں کچھ محلے ایسے ہیں، جہاں عام طور پر ایک ہی قسم کے قومی پسِ منظر کے لوگ فروکش ہیں۔ ایسے محلوں میں جو دُکانیں ہیں، وہاں اب بھی پولش یا جرمن زبان سُنائی دے گی، یا کہیں چینی یا اطالوی چائے خانوں اور ہوٹلوں کی بھرمار ملے گی۔ تمام جنوب مغرب میں بہت سے لوگ ایسے ہیں، جو ہسپانوی زبان بولتے ہیں۔ ان کے آبا و اجداد یہاں ابھی یہ امریکی علاقہ نہیں بنا تھا کہ رہا کرتے تھے۔ نیویارک شہر میں یہودیوں کی بھاری آبادی ہے۔ اگرچہ نسلی اعتبار سے نیگرو اور پیورٹو رکینی لوگ ان سے کہیں زیادہ ہیں۔

یہ قدرتی بات تھی کہ انگریزی زبان نہ بولنے والے نو آبادکار اپنی ہی قسم کے تہذیبی ورثہ رکھنے والوں کے ساتھ رہنا پسند کرتے تھے۔ اگرچہ امریکہ میں جو عام تہذیب تھی، اس سے اس قسم کی علیحدگی سماجی اور اقتصادی طور پر نقصان دہ تھی۔ اب تیزی کے ساتھ سب نسلیں آپس میں مدغم ہو رہی ہیں۔ اور مختلف قومی بُنیادوں کی وجہ سے جو اختلافات پائے جاتے تھے، یا تو ختم ہو رہے ہیں یا بے اہمیت۔ افراد کے ذاتی جذبات اور اُس کی شخصیت کا احترام بڑھ رہا ہے۔ چاہے وُہ غریب ہو، یا امیر۔ اور یہی بات امریکیوں کے اس رویّے سے ثابت ہو رہی ہے، جو دُنیا بھر کی قوموں سے روا رکھتے ہیں۔

فنونِ لطیفہ

ادب

اگرچہ امریکی شعر و ادب انیسویں صدی کی تیسری دہائی تک نشو ونما پانے نہیں لگا تھا۔ تاہم یہ اب اِسقدر متنوع اَور زیادہ ہَے۔ کہ اس مختصر جائزہ میں اس کا وسیع ذکر ممکن نہیں۔ یہاں تو صرف اتنا ہی ممکن ہے کہ چند ایسے سرکردہ امریکی مصنفین کا ذکر کیا جائے جو بہت مقبول ہیں۔ اَور کِس طرح ان کی تحریریں ان رجحانات اَور میلانات کی مظہر ہیں، جن کا بیان اِس کتابچہ کے دوسرے باب میں آیا ہَے۔ مثال کے طور پر ادب میں فرنٹیر سپرٹ ار رُوحِ سرحد کا کِس طرح ذکر آتا ہَے؟ اَور آیا اس میں پیوری ٹن ازم کا اثر ظاہر ہوتا ہَے۔ اور کیسے؟ اور مُلک میں تیزی کے ساتھ جو صنعتی ترقی ہو رہی ہَے اس کا اثر اس رُوحِ سرحد نے کِس طرح لیا ہے؟

غیر ملکوں میں امریکی مصنفین بہت عرصے سے مقبول چلے آ رہے ہیں۔ اور دوسری جنگ عظیم سے بہت سے یورپی ممالک میں ان کی بہت مانگ ہونے لگی ہے۔ جن کو بہت پسند کیا جاتا ہے۔ اُن میں مندرجہ ذیل خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں:۔ مارک ٹوین۔ جیمز فینی مور کوپر۔ رالف والڈو ایمرسن۔ ایڈگر ایلن پو۔ والٹ وٹمین۔ جیک لنڈن۔ اپٹون سنکلر۔ تھیوڈور ڈرائزر۔ سینکلر لی وِس۔ جان ڈوس پاسوس۔ ارنسٹ ہمینگ وے۔ ولیم فاکنر —— اور تھارن ٹن وِلڈر۔

مارک ٹوین کا بیان ایک امریکی ادیب کی زندگی کا بہت اچھا تعارف ہَے۔ ارنسٹ ہمینگ وے نے کہا تھا کہ صحیح امریکی ادب کا آغاز ۱۸۸۵ء میں مارک ٹوین کی کتاب ہکل بیری فن Huckle berry Finn کی اشاعت سے ہُوا۔ بلاشبہ اس سے قبل بہت سی امریکی کتابیں شائع ہو چکی تھیں۔ لیکن مارک ٹوین وُہ پہلے شخص تھے، جنہوں نے ایسے افسانوی طرز کا آغاز کیا۔ جس کا لہجہ۔ جس کا ترنم اور جس کا محاورہ امریکہ کی بول چال سے لیا گیا تھا۔

سچ بھی یہ ہَے کہ مارک ٹوین نے جن کا اصلی نام سیمُوئل لینگ ہوان کلی منس تھا۔ مکمل طور پر امریکی زندگی بسر کی۔ وُہ ۱۸۳۵ء میں پَیدا ہُوئے اور میسوری کے ایک چھوٹے سے مس سسی پی ایور ٹاؤن میں پرورش پائی۔ اس

جگہ شمال اور جنوب مِلتے تھے۔ اس زمانہ میں ریاست متحدہ امریکہ کے دوہزار میل وسطی میدان میں تجارت کا سب سے بڑا ذریعہ ہی مس سس سپی تھا۔ (اور مس سس سپی میں ایک تختہ جہاز پر بہتے ہُوئے ہی ہیکل بیری فن کے اہم کردار —— ایک بے گھر لڑکا اور ایک مفرور غلام —— مہموں سے دوچار ہوتے ہیں۔)

اپنے والد کی موت اور سکول کی ابتدائی تعلیم کے بعد جبکہ مارک ٹوین ابھی بارہ برس کے تھے کہ وُہ اپنے بھائی کے ہاں جو ایک پرنٹر تھے، کام سیکھنے لگے۔ بالکل اسی طرح جیسے کہ ایک صدی پہلے بنجمین فرینکلن نے سیکھا تھا۔ مارک ٹوین نے اس اخبار میں جِس میں وُہ کام کرتے تھے، مزاحیہ مضمون لِکھے۔ بعدازاں انہوں نے دریائے مس سس سپی میں جہازران کی کامیاب تربیت حاصل کی۔ چونکہ دریا اپنا راستہ ہمیشہ بدلتا رہتا تھا۔ اِس لئے ایک کامیاب جہازران کے لئے بہت اعلیٰ تربیت درکار ہوا کرتی تھی۔

ٹوین نے دریائی تجربات کو اپنی کتاب "مِی سس سپی پر زندگی" Life on the Mississippi میں بیان کیا ہے۔ ایک اور سوانح حیات قِسم کی کتاب رفنگ اِٹ Roughing It میں انہوں نے دُور پچھم کے علاقہ نوادا کے کانوں کے کیمپوں میں پیش آنیوالی مہموں کا ذکر کیا ہے۔ وہاں مارک ٹوین اپنے بھائی کے ہمراہ خانہ جنگی کے آغاز میں ایک غیر منظم جنوبی فوج کی ملازمت ترک کرکے گئے تھے۔ مارک ٹوین کو جنوب کے علاقوں کے آقاؤں سے کوئی ہمدردی نہ تھی۔

اخبار کے نامہ نگار کی حیثیت سے مارک ٹوین پہلے تو کیلے فورنیا تک گئے اور اس کے بعد ہوائی کے جزیروں میں پہنچ کر وہاں اپنے تجربات پر لیکچر دینے لگے۔ اپنی تمام زندگی میں مارک ٹوین کی خوب مانگ رہی۔ اس مقبولیت کا راز اُن کی خوبصورتی، ان کی پیاری پیاری آواز۔ مزاح اور ڈرامہ کے عمدہ احساس میں پنہاں تھا۔ اُن کے لیکچروں نے ان کی تحریروں کو عام پسند کی زبانی سُنائی جانے والی کہانیوں کے انداز کے قریب لانے میں مدد دی۔

اُن کی ایک طویل داستان "دی سیلی بریٹیڈ جمپنگ فراگ آف کیلاورس کاونٹی" The Celebrated Jumping Frog of Calaveras County مشرق میں خوب مقبول ہُوئی۔ اس سے حوصلہ پاکر وہ یورپ اور یروشلم کے سفر پر نکل پڑے۔ اس سفر کے نتیجہ میں جو کتاب انہوں نے انوسنٹس ابراڈ Innocents Abroad 1869 لِکھی۔ وُہ ہاتھوں ہاتھ بِک گئی۔ انسانی ہمدردی کا اِس کتاب میں وسیع جذبہ تھا۔ لیکن حکمرانوں کے بارے میں یہ منکرانہ۔ مزاحیہ بلکہ اکثر مقامات پر گستاخانہ تھی چاہے یہ حکمران چرچ سے متعلق ہوں، یا ریاست اور روایتی کلچر سے۔

خانہ جنگی کے بعد جو رشوت ستانی پائی جاتی تھی۔ اس کے خلاف مارک ٹوین نے اپنی کتاب "دی گلڈڈ ایج" The Gilded Age میں خوب خوب چوٹیں کی ہیں۔ اپنی ایک اور کتاب "اے کونیکٹی کٹ یانکی اِن کنگ آرتھرز کورٹ" A Connecticut Yankee in King Arthur's Court میں انہوں نے زمیندارانہ عدم مساوات اور مادی کامیابی پر امریکیوں کو جو مسرت ہوتی ہے، اُس پر حملے کئے ہیں۔

"پڈن ہیڈ ولسن" —————— اور —————— "دی مین ڈیٹ کورپٹڈ ہیڈلے برگ"
Pudd'n head Wilson, The man that Corrupted Hadleyburg

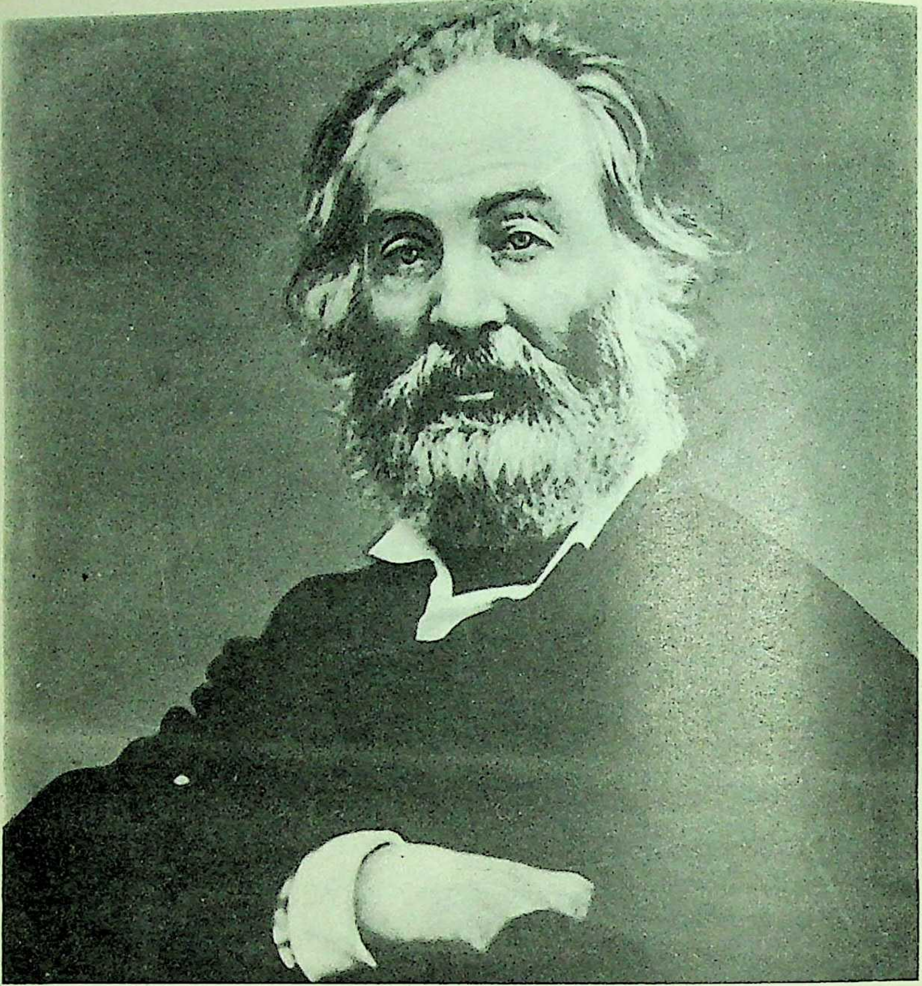

شاعرِ جمہوریت والٹ وہٹ مین جن کی شاعری میں ہندوستانی کلچر کی جھلک پائی جاتی ہے۔

میں اُنہوں نے چھوٹے شہروں کے لوگوں میں جو کمینہ حرکات اور رواداری کی کمی پائی جاتی ہے، اس کو ظاہر کیا ہے۔ لڑکوں کے عالمی ادب میں ٹوم سییے ور Tom Sawyer ایک نہایت عمدہ کتاب ہے۔

ساری زندگی مارک ٹوین لیڈر جاناتھن ایڈورڈز کی طرح جِس کا اُنہوں نے مطالعہ کر رکھا تھا اخلاقی ذمہ داری اور عقیدۂ جبر کو ہم آہنگ کرنے میں مصروف رہے۔ ہیکل بیری فِن یوں تو ایک طفلانہ مہم کی داستان ہے۔ لیکن وُہ انفرادی ضمیر۔ انصاف اور وفاداری کا قصہ بھی ہے۔ ناول میں جو لطافت اور خوبصورتی پائی جاتی ہے وُہ ترجمہ میں ہمیشہ قائم نہیں رہتی۔ گو اِس کا اثر زیادہ تر نیگرو اور دوسری بولیوں کے استعمال، نیز ایک اَن پڑھ لڑکے کے تازہ شعور کے امریکی محاورہ میں بیان پر انحصار رکھتا ہے۔

'فینی مور کی ادبی غلطیوں' کے نام سے مارک ٹوین نے ایک پُرمزاح مضمون لِکھا تھا۔ جس میں اُنہوں نے موصوف

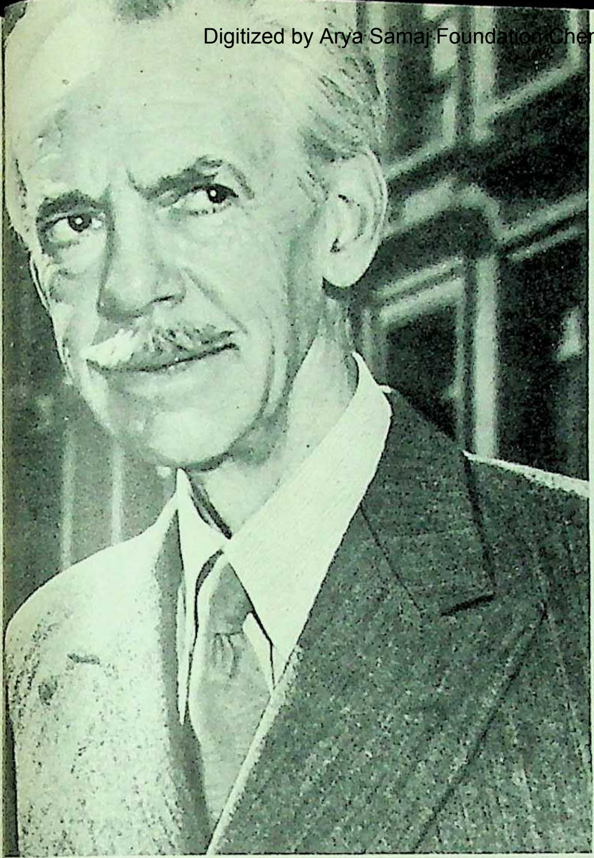

سرکردہ ڈرامہ نگار اور نوبل انعام

حاصل کرنے والے یوجین اونیل

کے ناول "دی لاسٹ آف دی موہی کن" The last of the Mohicans 1826 پر نشتر زنی کی تھی۔ چونکہ اس ناول کے کرداروں کی گفتگو امریکی زندگی کی بجائے برطانوی ناول کا چربہ نظر آتی تھی اور سرحد کی زندگی کا بیان اپنے ذاتی تجربہ پر قائم نہ تھا۔ بلاشبہ کوپر نے سر والٹر سکاٹ کے کئی ایک رومانی طریقوں سے کام لیا ہے۔ لیکن اسکی لیدر سٹاکنگ ٹیلز Leatherstocking Tales نیز سرحد پر۔ سمندر میں اور کہستان میں پیش آنیوالی مخصوص امریکی مہموں کی داستانوں نے دُنیا بھر میں کئی نسلوں کے خیالات میں ہلچل پیدا کی ہے۔ اس کا ہیرو ناٹی بم پو Natty Bumppo, جو شکاری اور راہ جو ہے۔ سرحدی رُوح کا ایک نہایت دلیر جسمانی رُوپ ہے۔

میساچوسٹس کے مضمون نگار رالف والڈو ایمرسن اور اُس کے شاگرد نیویارک کے مشہور شاعر والٹ وہٹ مین میں انفرادی رُوح کا اظہار زیادہ فلسفانہ اور ذاتی طور پر ہوتا ہے۔ دونوں ہی قوم کے ابتدائی دور کی رجائیت پسندی اور تصوری ہمدردیاں نیز روایات کے خلاف جذبے کا اظہار کرتے ہیں۔ ان دونوں کے ادبی نظریے خانہ جنگی سے ماقبل کے سنہری دِنوں میں تشکیل پا گئے تھے۔

مارک ٹوین کی طرح ایمرسن بھی لیکچرار تھے۔ اور وُہ ایسے لکھتے تھے، جیسے کہ کسی موجود مجمع سے خطاب کر رہے ہوں۔ فرینکلن کی مانند انہوں نے امریکیوں کو ضرب المثل دیئے اور نصیحت آموز حکائیتیں سنائیں۔ جن میں انفرادیت اور آزاد رُوح چمکتی ہے۔ "جو کوئی بھی انسان بننا چاہتا ہے، اسے غیر مقلد ہونا چاہیئے"۔ "بے وقوفانہ یکساں روی چھوٹے دماغوں کی شرارت ہے"۔ "اگر کوئی شخص واحد اپنے وجدان پر جم جائے۔ اور اس پر قائم رہے۔ اتنی بڑی دنیا اس کے گرد گھومنے لگے گی"۔ "بڑا ہونا یہ ہے کہ لوگ تم کو غلط سمجھیں"۔ "دُنیا ہر انسان کی تعلیم کے لئے قائم ہے"۔

والٹ وہٹ مین کی کتاب لیوز آف گراس Leaves of Grass جو ۱۸۵۵ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی تھی، اگلے تیس برس میں لگاتار بدلی گئی۔ اور اُس میں اضافے ہوتے رہے۔ وہٹ مین شعوری طور پر جمہوریت اور ترقی پذیر امریکہ کے شاعر کی حیثیت سے اُٹھے تھے۔ انہوں نے بے بحر کا اسلوب Free-verse Style اپنایا جو انہی سے مخصوص ہے۔ اور اپنی نظموں میں امریکی ناموں۔ مقالوں، وارداتوں اور امریکی زندگی کے حقیر ترین پہلوؤں کو جمالیاتی رنگ دیکر بھر دیا۔ ساتھ ساتھ ہی انفرادی اور اخلاقی نصیحتیں بھی کیں۔ قانون کی بندشوں اور پرانے نمونوں سے بے نیاز ہو کر وُہ ایک شخص کو، یعنی انسان کو آزادانہ۔ مکمل اور صحیح طور پر ضبطِ تحریر میں لانے کا مصمم ارادہ رکھتے تھے۔ (البتہ انیسویں صدی کے نصف آخر میں وُہ اپنی تشریح کرنا چاہتے ہیں)۔

بہرحال اِس دَور کے دوسرے ادیبوں میں گناہ کا پیوری ٹن تصور اور کہ "الیشور کی لیلا نیاری" کا خیال جاگزیں رہا ہے۔ "دی سکارلٹ لیٹر" ۱۸۵۰ء The Scarlet Letter 1850 اور "دی ہاؤس آف سیون گیبلز" ۱۸۵۱ء The House of Seven Gables 1851 میں ناتھینیل ہاتھورن نے مذہب اور اخلاق کے خاص امریکی تجربات کا ادبی ذکر کیا ہے۔ ہاتھورن کے دوست ہرمین میل وِل نے ۱۸۵۱ء میں ایک کتاب موبی ڈِک Moby Dick لکھی۔ انیسویں صدی کی سب سے زیادہ زیر بحث آنیوالی کتابوں میں یہ بھی شامل ہے۔ میل وِل اگرچہ ایک تہذیب یافتہ خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ لیکن وُہ دُنیا کے دُور دراز کونوں میں ایک معمولی جہازران کی حیثیت میں خطرناک مہموں سے دوچار ہونے کیلئے گیا۔ ویل مچھلی پر سوار ہو کر دریائی سفر کی یہ ایک ہی موجود کتاب ہے۔ لیکن یہ انسان کے شیطانی جذبات۔ اخوت اور گناہ سے نجات پانے کے امکانات کا ایک گہرا مطالعہ بھی ہے۔ یہ ناول جہاں بے حد حقیقت پسندانہ ہے۔ وہاں بہت زیادہ مجازیہ (حقیقت کو پردے میں بیان کرنا) بھی ہے۔

انیسویں صدی کے آخری دَور میں امریکہ میں وہی مادی ترقی رونما ہوئی جو مغربی یورپ میں صنعتی انقلاب کی وجہ سے آئی تھی۔ لیکن اس دَور کے تین اہم ادیبوں نے جو کچھ لکھا، اس میں ان کی ذہنی گہرائی۔ اخلاقی بلندی اور فن پر دستگاہ ملتی ہے۔ علاوہ ازیں انہوں نے مقامی امریکی ثقافت کی روایات کا بھی کماحقہ فائدہ اُٹھایا ہے۔ اِن تینوں ادیبوں کے نام ہیں: ایمیلی ڈکن سن۔ (شاعر) ہنری آڈمز (مورخ) اور ہنری جیمز (ناول نویس اور نقاد)۔

ایمیلی ڈکن سن اگرچہ نیو انگلینڈ کے چھوٹے سے کالج ٹاؤن کی ایک گوشہ نشین عورت تھی۔ لیکن اُس نے جو شاعری کی ہے۔ وُہ مزاح اور ذہنی بلندیوں میں انگریزی زبان کے بڑے باریک بین شاعروں سے ٹکر کھاتی ہے۔ اس کا خاندان کئی پُشتوں سے پیوری ٹن چلا آرہا تھا۔

دی ایجوکیشن آف ہنری آدمز The Education of Henry Adams

ایک شاندار لیکن ادق کتاب ہے۔ جس میں مصنف نے تاریخی یاس انگیزی اور سماج سے ذاتی علیحدگی کا اظہار کیا ہے۔ آدمز کے دادا اور پڑدادا امریکہ کے صدر تھے۔ اُس کی سوانح حیات امریکہ اور دُنیائے جدید کا گہرا اور بدیلح تجزّیہ ہے۔

ہنری جیمز نے صنفِ ناول کو ایک پیچیدہ اور باشعور فن کے معیار پر پہنچا دیا۔ جیمز جسکی زندگی کا بیشتر حصّہ یورپ میں گزُرا تھا۔ بین الاقوامی موضوعات میں اور امریکی تجربات کو یورپ کے مقابلہ میں دیکھنے میں خاص طور پر دلچسپی لیتا تھا۔

۱۸۹۰ء کے بعد امریکہ میں سماجی ناولوں کا ایک سیلاب امڈ آیا۔ ان پر یورپ کے حقیقت پسند اور نیچری ادیبوں خاص طور پر بلزاک اور زولا کا کچھ کچھ اثر پڑا تھا۔ اچھے ادیب اِسقدر ہیں کہ ان کا ذکر کرنا ناممکنات میں سے ہے۔ ان میں سے اکثر ریاست ہائے متحدہ امریکہ سے باہر بھی خاصے مشہور ہیں۔ اس سِلسلے کے کچھ ادیب جو پہلے دَور میں ہوئے، یہ ہیں: جیک لنڈن۔ فرینک نورس۔ سیٹی فن کرین۔ اپ ٹن سینکلیر، تھیوڈور ڈرائزر، شیروڈ اینڈرسن اور سنکلیر لیوس۔ اِس دَور کے ادیبوں میں جن کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، وُہ ہیں: جیمز۔ ٹی۔ فارل۔ جان سٹین بک۔ جان ڈوس پے سوس۔ سال بیلو۔ رابرٹ پن وارن اور ارنسٹ ہمینگ وے اور ولیم فاک نر۔ تین ادیبوں یعنی لوس۔ ہمنگ وے اور فاک نر کو انعام مِل چکا ہے۔ (ہمینگ وے ۱۹۶۱ء میں انتقال کر گئے)

امریکی ڈرامہ نویسوں میں یوجین اونیل سب سے مشہور ہیں۔ ان کو بھی انعام مِلا تھا۔ اُن کی موت ۱۹۵۳ء میں ہُوئی۔ اونیل کے ڈراموں میں سماجی مسائل سے زیادہ انفرادی زندگی کے تصدیق طلب اور تاریک پہلوؤں کا نقشہ مِلتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ ڈرامے یونانی ٹریجڈی کی رُوح کی طرح امریکی تجربات بیان کرتے ہیں۔ آرتھر ملر اور ٹے نے سی ولیمز کے ڈراموں میں بھی زندگی کی ایسی ہی تاریکیوں کا ذکر ہے۔ یہ دونوں ڈرامہ نویس لکھتے وقت سٹیج کا خاص طور پر خیال رکھتے ہیں۔

اپنے دَور کی کہانیوں میں ٹامس ولف کی کتاب کا جس میں سوانح حیات کی گہری جھلکیاں مِلتی ہیں۔ الگ مقام ہے۔ ولا کاتھر جنہوں نے امریکہ کی مقامی زندگی کا نہایت پیارا گیتوں بھرا ذکر کیا ہے۔ امریکہ سے باہر اِس قدر مشہور نہیں ہیں، جتنا کہ انہیں ہونا چاہیئے۔ البتہ تھارن ٹن ولڈر جنہوں نے "اوور ٹاؤن"۔ Our Town کتاب لکھی دُنیا بھر سے خراجِ تحسین لے چکے ہیں۔ سکاٹ فزجیرالڈ کی کتاب "دی گریٹ گٹ سبی" The Great Gatsby امریکہ میں اِس بنا پر خوب مشہور ہُوئی کہ اس میں ۱۹۲۰ء کے بعد آنے والے جاز دور Jazz Age کی رومان بھری اور غمناک تصویر کھینچی گئی ہے۔ امریکہ کے ادبی اور سماجی ارتقا میں یہ ایک اہم دَور تھا۔

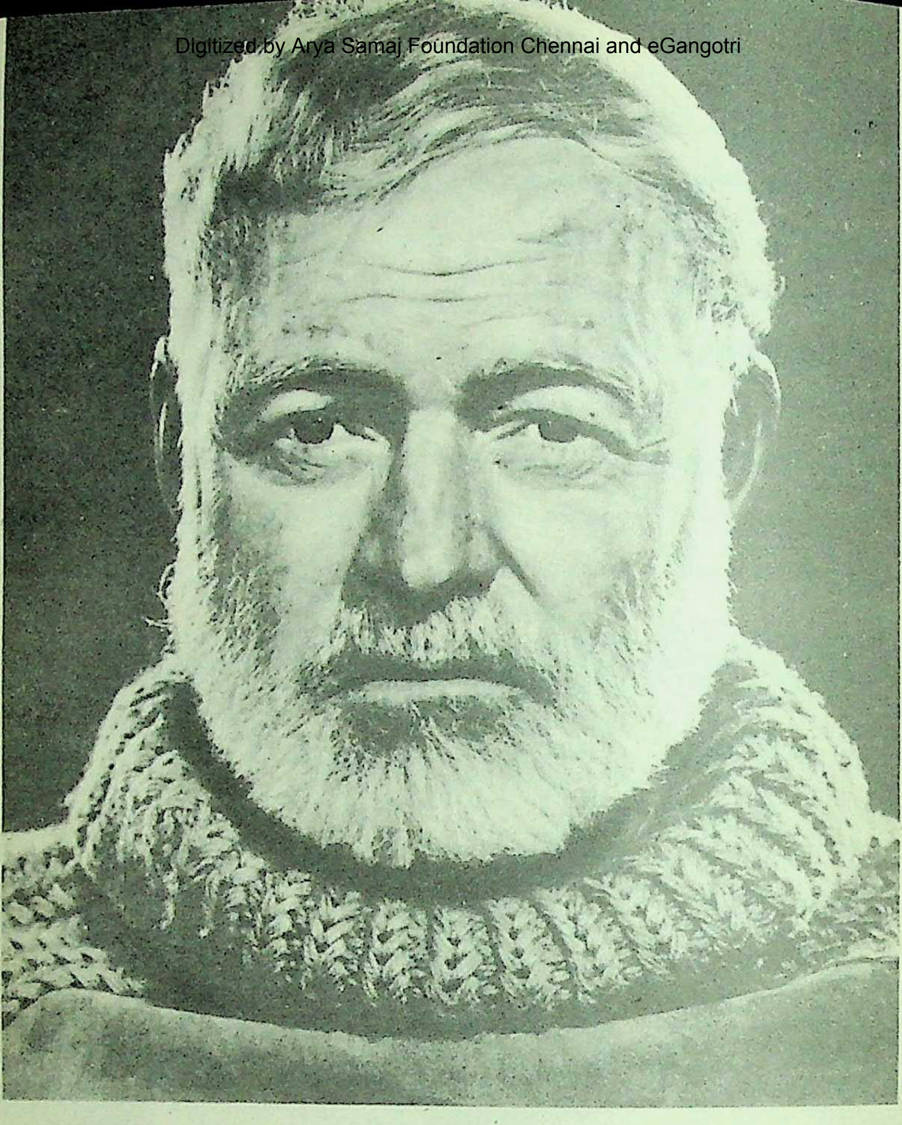

جدید امریکی ناول نگار ارنسٹ ہیمنگ وے

سماجی حقیقت پسندوں کے مقابلہ میں، نوخیز ادیبوں کے ایک گروہ نے جن میں سے اکثر جنوب سے تعلق رکھتے ہیں۔ اپنے انفرادی تجربات خاص طور پر تنہائیوں اور محبّت کے ذریعہ انسان کو سمجھنے کا شاعرانہ ذکر کیا ہے۔ ان میں کیتھرائن این پورٹر۔ بوڈورا ولٹی۔ کارسن میک کُلرز۔ ٹرومین کیپوٹے اور جی ڈی سیلنگر خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

ارنسٹ ہیمنگ وے غالباً امریکہ کے دورِ جدید کے وُہ ناول نویس ہیں، جنہیں دوسرے مُلک بخوبی جانتے ہیں۔ بہت سے لوگوں کو ہیمنگ وے اپنی سادگی۔ جذبات پسندی، مضبوطی اور مزاح میں کلی طور پر امریکی نظر آتے ہیں۔ لیکن یونیورسٹیوں میں ولیم فاکنر کو زیادہ پسند کیا جاتا ہے۔ ان میں اور قدیم ادیبوں مثلاً میل وِل اور ہاتھورن میں بہت کچھ مشترک باتیں ہیں۔ اساسی طور پر ان کا تعلق اخلاق سے ہے، جس کا وُہ مجاز اور کنائیوں

میں ذکر کرتے ہیں۔ اِس کے ساتھ ساتھ وُہ مس سسی سپی میں ایک تصوّری مُلک کی تاریخ کی مکمل ترتیب دیتے ہیں۔ اس دَور سے جب کہ سفید فام لوگ پہلی بار وہاں آئے تھے۔ ان کے ایک کے بعد دوسرے ناولوں میں اپنی خاندانوں کے وہی افراد جن کا پہلے ذکر آچکا ہے۔ وہی نیگرو اور سفید فام۔ وہی اُونچے اور نچلے طبقے کے لوگ پیچیدہ قِسم کے رشتوں میں بار بار نظر آتے ہیں۔ بہت سے واقعات تو اتنے شدید ہیں کہ بے اختیار آنسو آجائیں۔ فاک نر کی کتابیں ان کے صنفی تجربوں اور نئی اختراع پسندیوں کی بنا پر اکثر ادق ہوتی ہیں۔

فاک نر کی کتابیں یونیورسٹی کے طلبا کو اِس لئے پسند آتی ہیں کہ ان میں معنوں کی کئی سطحیں ہیں اور مفسر کو مطالب بیان کرنیکا بہت اچھا موقع ہاتھ آتا ہے۔ میل وِل کی "موبی ڈک"۔ ہنری جیمز کے ناول ٹی ایس ایلیٹ اور ازرا پاؤنڈ کی شاعری اور بھی زیادہ گہری ہے۔

نامور امریکی فلسفی اور مفکر — جان ڈیوی

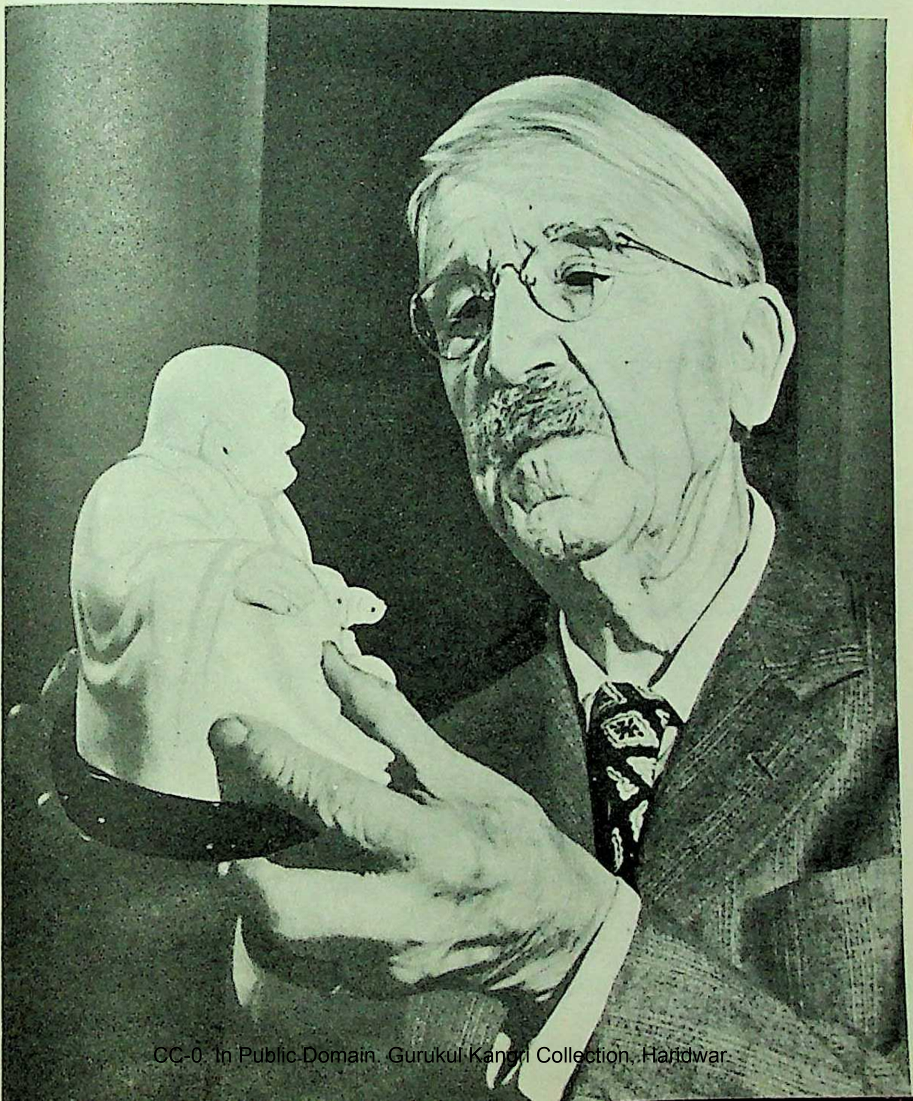

بعض اوقات اس دَور کو امریکی ادب میں زمانۂ تنقید سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں تیس چالیس مجلّے ایسے ہیں، جو خاص طور پر تفسیری تنقید کا کام کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ روائتی قِسم کی تنقید کے رسالے الگ ہیں۔ ان میں جو تنقید ہوتی ہے، وُہ بہت گہری ہوتی ہے۔ اور زبان تشبیہ و استعارات۔ کنایات اور اصنافِ سخن کے تعلقات کا خاص دھیان رکھا جاتا ہے۔ سماجی موضوعات کا بھی ذکر آجاتا ہے۔ اور نفسیاتی مطالعے کی گہرائیاں بھی بیان ہوتی ہیں۔

نوخیز ادیبوں نے ٹی ایس ایلیٹ۔ ازرا پاونڈ اور ولیس سٹی ونز کو بہت پسند کیا ہے۔ اور ان کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ شاعری کو بیانیہ یا ڈرامائی سے زیادہ موسیقی زا بنایا جائے، اور ساتھ ہی یہ بہت زیادہ کنایہ آمیز۔ عالمانہ، اور پیچیدہ ہو۔ لیکن اس کے باوجُود کارل سینڈبرگ اور ولیکل لینڈسے ایسے شاعروں نے امریکی مواد سے فائدہ اُٹھایا ہے اور اس کو عام پسند طرز میں بیان کیا ہے۔ ان دونوں گروہوں کے درمیان رابرٹ فروسٹ Robert Frost کھڑے ہیں۔ انہیں یونیورسٹیاں بھی پسند کرتی ہیں، اور عوام بھی۔ فروسٹ غالباً بیسویں صدی کے وُہ شاعر ہیں، جنہیں سب سے اوّل اس بنا پر پڑھنا چاہیئے کہ اس سے امریکی لہجے۔ طرز اور مزاح کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ دو اور شاعر جو امریکی محاورہ اور امریکی مواد استعمال کرنے میں امتیاز رکھتے ہیں۔ ای۔ ای۔ کومینگز اور ولیم کارلوس ولیمز ہیں۔

بعض پہلوؤں میں اپنے وطن کے ضمن میں امریکیوں کے جو صحیح جذبات ہیں، ان کا اظہار ادب کی بجائے سوانح عمریوں اور تاریخی کتابوں میں زیادہ ہوا ہے۔ اور اس مختصر سے جائزے میں ان تمام کثیر التعداد کتابوں کا ذکر کرنا ناممکن ہے۔ ابراہیم لنکن پر ہزاروں کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں سب سے مقبول کتاب چھ جلدوں میں کارل سینڈبرگ نے لکھی۔ جو ایک شاعر ہیں۔ اوّلین نوآبادکاروں کے بارے میں نئی نئی کتابیں چھپ رہی ہیں۔ خاص طور پر واشنگٹن۔ فرینکلن اور جیفرسن کے بارے میں۔ امریکی خانہ جنگی سے لوگوں کو جو دلچسپی ہے، اس کی کتابیں شائع کرنیوالے کوئی انتہا نہیں پا رہے۔

علاقائی اور جغرافیائی ادب بھی بہت ہے۔ اور اکثر کتابیں باتصویر ہیں۔ کِسی کتاب گھر میں چلے جایئے، آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ امریکی روایت کی بہت قدر کرتے ہیں اور خاص طور پر اپنے مُلک کی روایات کی۔

باقاعدہ کتاب گھروں میں ہی نہیں (اور بعض علاقوں میں یہ نایاب بھی ہیں)۔ بلکہ دوا فروشوں کے ہاں اور ریلوے سٹیشنوں پر جہاں کہ کاغذ کی جلد کی کتابیں فروخت ہوتی ہیں، ہر شخص کو عمدہ قِسم کا بین الاقوامی ادب میسر آجائیگا۔ کاغذ کی جلد والی کتابیں خوب بِک رہی ہیں اور پڑھی جا رہی ہیں۔ ان کو کمرشل پبلیشرز شائع کر رہے ہیں۔ اور اِس غرض سے کہ نفع حاصل کر سکیں۔ وُہ ان کتابوں کو ہزاروں کی تعداد میں شائع کرتے ہیں۔ ان کتابوں میں نئے نئے ناموں کا لگاتار اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ حال ہی میں ان عمدہ کتابوں کی ایک فہرست پر نظر پڑی، جس میں ۶۰۰۰ ناموں کا ذکر ہے۔ اس فہرست میں یورپ کی تمام اعلےٰ کلاسیکی کتابیں ہیں۔ ان کے علاوہ مشرق کے مذاہب کے متن۔ اور اُونچے درجے کی تعلیم کی کتابیں۔

فلاسفی

بنجمین فرنیکلن نے کہا تھا کہ امریکی سب سے پہلے کسی شخص سے یہ پوچھتے ہیں کہ "وہ کیا کر سکتا ہے"۔ امریکی فلاسفر بھی یہی سوال غیر مادی تصوّر سے کرتے ہیں۔ خانہ جنگی کے بعد سے فلسفہ کا زیادہ تر تعلق عملیت سے رہا ہے۔ فلسفہ عملیت سے مراد یہ ہے کہ خیالات کو اساسی طور پر اعمال یا اعمال کی تشریح میں بطور رہنما کے مانا جائے۔ خیالات کیا نتائج پیدا کرتے ہیں، اس سے خیالات کا امتحان ہوگا۔ صداقت تک رسائی تجربات سے ہوگی۔ اور اقدار کی اہتمام ان کے سماجی اور اخلاقی ہونے میں ہے۔

امریکہ کے سرکردہ فلاسفر ولیم جیمز (۱۸۴۲-۱۹۱۰) نے خود کو کئی ناموں سے پکارا ہے۔ مثلاً نظریۂ عملیت کا قائل"۔ "کثرتِ جوہر کا پیروکار"۔ اور "اصولِ تجربی کا حامی"۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ولیم جیمز جو ہنری جیمز ناولسٹ کے بھائی تھے، فلاسفر سے زیادہ ماہرِ نفسیات تھے۔ پرنسپلز آف سائیکالوجی کے مشہور ترین ابواب میں شعور کی دھارا اور اندرونی زندگی کی حقیقت بیان کی گئی ہے۔

جیمز کا عقیدہ تھا کہ نفس کثرتِ وجود کا مظہر ہے۔ اور اس کے مختلف بلکہ اکثر اوقات مخالف اجزا میں وقتی طور پر جمہوری طرز کا سمجھوتہ ہو جاتا ہے۔ جس کی بنا پر یہ چل رہا ہے۔ لیکن پیوریٹنز کی اولاد ہونیکی بنا پر وہ عزم کے اختیار اور اس کی قوت کے مسائل میں زیادہ دلچسپی لیتے تھے۔ ان کے مشہور ترین مضامین میں ایک کا موضوع تھا "اختیارِ اعتقاد" The Will to Believe

بطور فلاسفر ولیم جیمز ادعا پسندی اور اسناد کے خلاف تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ کائنات ایک غیر مربوط اعمال کا مجموعہ ہے جن کے اثرات کا کسی قاعدۂ کلیہ کے ذریعہ ذکر نہیں کیا جاسکتا۔ اپنے مضمون "مختلف فیہ مذہبی تجربات" The Varieties of Religious Experience میں اس کی دلچسپی اس میں تھی۔ کہ مذہبی تجربات کس قسم کے اور کتنے وسیع ہوتے ہیں اور اس میں کم کہ ان کی پشت پر دینیات کی کسقدر حقیقتیں پنہاں ہیں۔ جیمز کا فلسفہ کھلی شاہراؤں۔ چوڑی سرحدوں اور خود مختار نفس کی اختراعی قوتوں کا فلسفہ ہے۔ جارج سین تینا George Santayana نے ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں "کردار اور رائے عامہ" Character and opinion in the United States میں جیمز کے فلسفہ کا نہایت پیار بھرے انداز میں لیکن تنقیدی طور پر جائزہ لیا ہے۔ اور ان کا والٹ وہٹ مین سے مقابلہ کیا ہے۔

نظریات کا اعمال یا کردار سے جو تعلق ہے، اس میدان میں جان ڈیوی John Dewey 1859-1952 نے جیمز کی پیروی کی۔ وہ نظریات کے سماجی کردار میں اور خاص طور پر تعلیم میں یہ کس قدر کام آتے ہیں۔ ان میں جیمز سے زیادہ دلچسپی رکھتا تھا۔ اور یہ دلچسپی نتیجہ تھی، اس نظریہ کا کہ خیالات میں لچک ہوتی ہے۔ ڈیوی کی ابتدائی کتابوں میں ایک کا نام ہے "ڈارون کا فلسفہ پر اثر" The Influence of Darwin on Philosophy اس نے بتایا کہ انسانی ذہن انسان کی ان کوششوں کا نتیجہ ہے جو اس نے اپنے آپ کو قدرت کے مطابق ڈھالنے یا اس پر فتح پانے کیلئے کیں۔ اُس نے جو کتابیں بعد میں لکھیں، ان میں مندرجہ ذیل بھی شامل ہیں: -

ڈیموکریسی اینڈ ایجوکیشن (۱۹۱۶ء) - ری کن سٹرکشن اِن فلاسفی ۱۹۲۹) - آرٹ ایز ایکس ری اِنس ۱۹۲۵ اور لوجک: دی تھیوری آف انکوائری (۱۹۳۸ء) - ڈیوی کو اکثر "انسٹرومنٹلسٹ" (ماہر ساز کا نام دیا جاتا ہے۔ وہ مابعد الطبیعات کے خلاف تھا۔ کیونکہ اس کا تعلق محض لفاظی سے ہے اور ایسے خیالی نظام سے، جن کا آگے کوئی عملی مقصد نہیں۔ نظریات کا مطالعہ اسی غرض سے ہونا چاہیئے کہ وہ سماجی اعمال میں افعال جز ہیں، یا نہیں۔ ڈیوی کے نظریہ تعلیم میں علم اور عمل ہم نام ہیں۔ اور علم مثبت عمل اور سماجی حالات پر قابو پانے کا ذریعہ ہے۔ ڈیوی کے نظریات نے نہ صرف امریکہ میں ہی بلکہ دوسرے ملکوں کے طرزِ درس و تدریس پر گہرا اثر ڈالا ہے۔

اگرچہ جیمز اور ڈیوی امریکہ کے دو اہم ترین نمائندہ فلاسفر ہیں۔ تاہم دوسرے فلاسفروں کا بھی یہاں خاصا اثر رہا ہے۔ جارج سین تی آنا سپین سے اس وقت آئے جبکہ وہ ابھی بچہ ہی تھے۔ بعد ازاں وہ بہت برسوں تک ہارورڈ یونیورسٹی میں پڑھاتے رہے۔ الفرڈ نارتھ وائٹ ہیڈ نے جو انگریز تھے، بہت دنوں تک ہارورڈ میں پڑھایا۔ اور ان کے آخری باثمر سال ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ہی گزرے۔ ان فلاسفروں کی کتابیں ان کے اپنے ملکوں کے بجائے -

عہد حاضرہ کے ایک ثقافتی امریکی گھر کا پائیں باغ

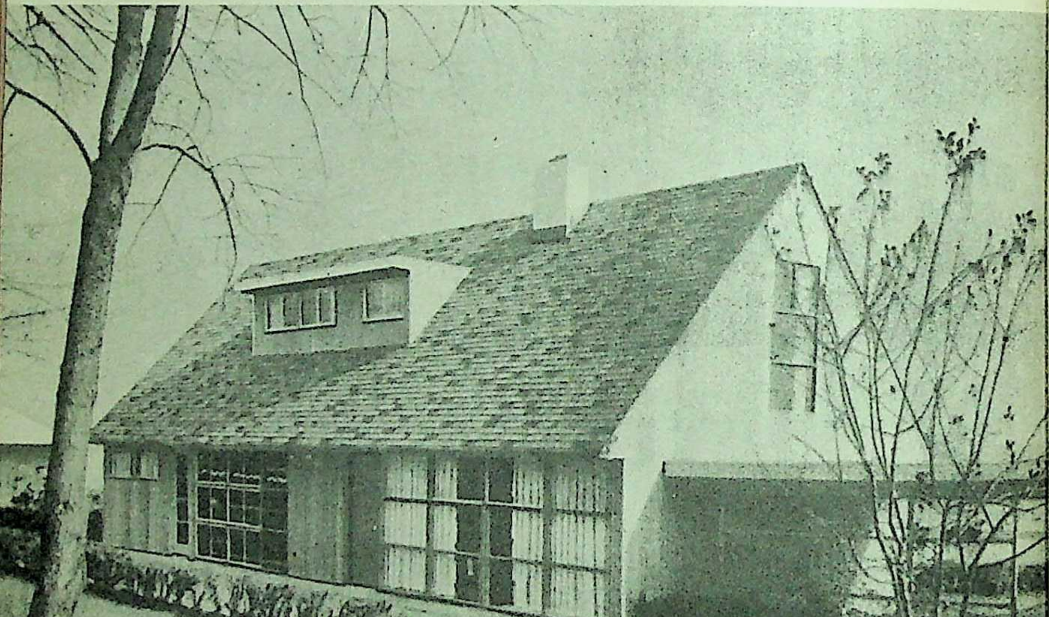

امریکہ میں زیادہ دِلچسپی سے پڑھی جاتی ہیں۔

امریکی یونیورسٹیوں میں علم تشخیص۔ علامتی منطق اور سائنسوں و گہری نفسیات سے فلسفہ کا جو صحیح تعلق ہے، ان کا خاص دِلچسپی سے مطالعہ کیا جاتا ہے۔ ان مطالعوں پر جو گہری نظر ڈالی جاتی ہے، اس نے علمی تنقید پر بھی گہرا اثر ڈالا ہے۔

اس تحریک کو جسے منطقی ثبوتیت پسندی کا نام دیا ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں وائنا کے سرکل کے ایک لیڈر رڈولف کارنیپ آئے، جو ۱۹۳۶ء سے امریکی یونیورسٹیوں میں پروفیسر چلے آرہے ہیں۔ ولیم جیمز کے آفادی نظریے اور جان ڈیوی نے سائنس اور منطق کا جو احترام سکھایا۔ ان دونوں نے مِل کر امریکہ کے نوجوان فلاسفروں کو کارنیپ کے فلسفہ اور مادی سائنسوں کو متحد کرنے کی کوششوں کو لبیک کہنے کے لئے تیار کر دیا۔ علم تشخیص میں دلچسپی کارنیپ اور برطانوی ماہرِ لسانیات اور نقاد ای اے رچرڈز نے پیدا کی ہے۔ رچرڈز کئی برسوں سے امریکہ کی ہارورڈ یونیورسٹی میں معلم چلے آرہے ہیں۔ برٹنڈ رسل اور جی۔ ای۔ مور کی کتابوں سے جِس تنقیدی فلسفہ کی نشوونما ہوئی۔ امریکہ نے برطانیہ کے ساتھ ساتھ اس میں شرکت کی ہے۔

ان منطقی اور تحلیلی رجحانات نے امریکہ کے حالیہ فلسفۂ استدلال کو زیادہ شدید بنا دیا ہے۔

فن تعمیر

امریکہ کے فنِ تعمیر کی جو خُوبی فی الفور نظر آتی ہے۔ وُہ یہ ہے کہ عمارتیں بہت زیادہ قِسم کی ہیں۔ امریکیوں نے

نیویارک شہر کا گگن ہیم عجائب گھر جس کی عمارت کا نقشہ فرینک لائڈ رائٹ نے تیار کیا تھا

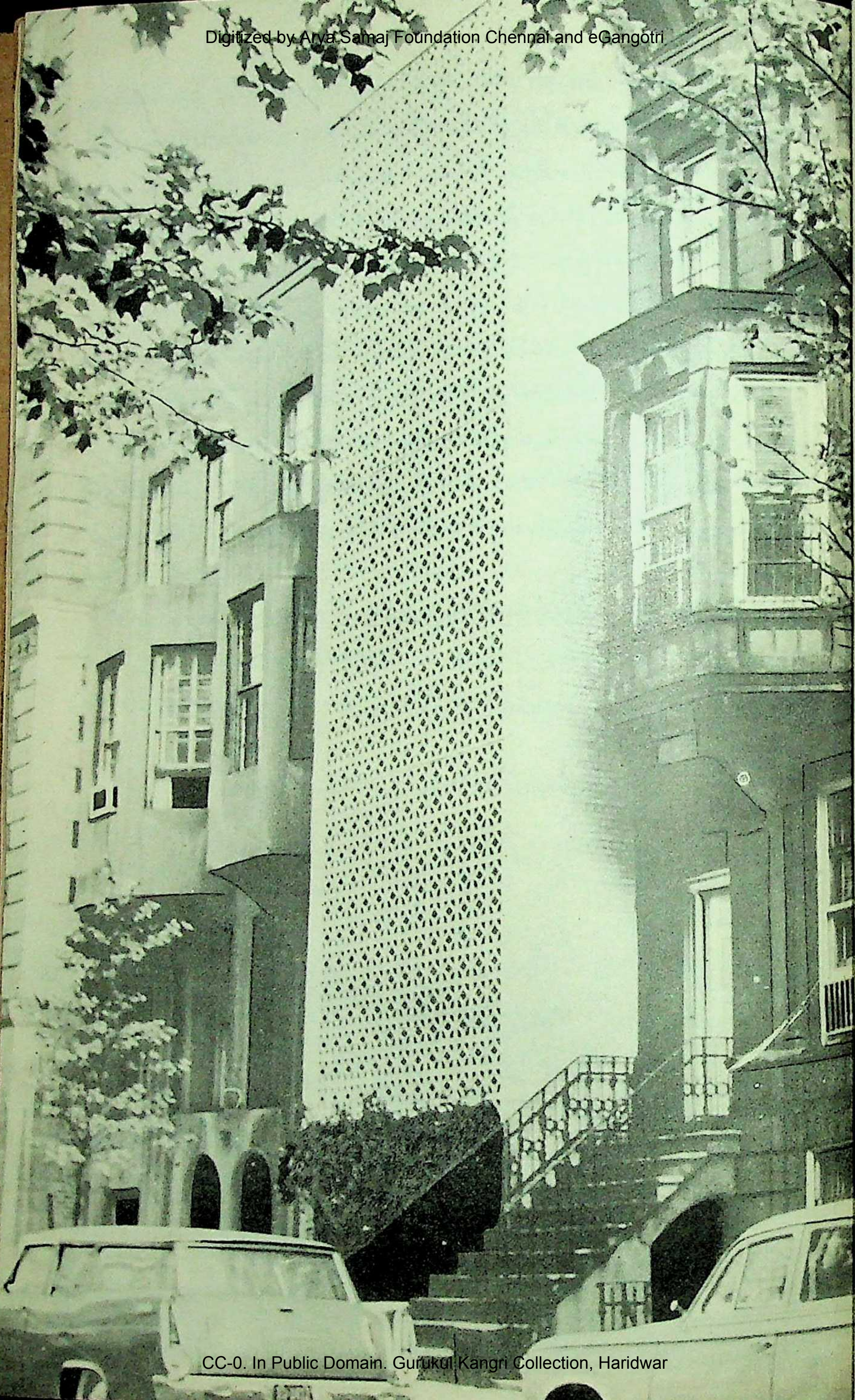

یورپ کے بلکہ ایشیا بھر کے ہر طرزِ تعمیر کی یا تو نقل کی ہے، یا اسے اپنی ضرورت کے مطابق ڈھال لیا ہے ۔ امریکیوں نے یونانی قسم کے مندر بنائے ۔ زمانہ وسطیٰ کے قلعے تعمیر کئے اور احیائے فرانس کے دور ایسے محل کھڑے کئے ۔ ایک ہی گلی میں آپ کو بالکل مختلف قسم کے نجی گھر ساتھ ساتھ کھڑے ملیں گے ۔ جدت دکھائی گئی ہے ۔ تو مقامی مسالے کے جمال بھرے استعمال ہیں، آسمان سے باتیں کرنیوالی مشہور عمارتوں کی تعمیر میں، اور نئی فیکٹریوں اور دفتروں کی صفائی اور خوبصورتی میں جو کام کاج میں معاون ثابت ہو سکے ۔

اوّلین نو آبادکاروں کو امریکہ کے وسیع جنگلات میں جنہیں آج تک کسی نے ہاتھ تک نہ لگایا تھا بہت بھاری مقدار میں لکڑی ملی ۔ چونکہ کھیتوں کو صاف کرنے کیلئے سب سے اوّل درخت کاٹنے ضروری تھے ۔ لہٰذا مکانات لکڑی سے بنائے جانے لگے ۔ اور اب بھی اگرچہ لکڑی پہلے سے مہنگی ہو گئی ہے ۔ اکثر چھوٹے چھوٹے گھر لکڑی کے ہی ہیں ۔

جنوب مغرب کے گرم خشک علاقوں میں ہسپانیوں نے نرم سفید پتھروں یا بھٹوں کی پکی ہوئی اینٹوں، جن پر خوبصورت پرگچ چڑھی ہوتی تھی، مکانات بنائے ۔ ان عمارتوں میں ڈھکے ہوئے صحن ۔ لکڑی کے مزیّن ستون اور چھت کی کڑیاں ہوتی تھیں ۔ کیلے فورنیا ۔ جنوب مغرب اور فلوریڈا کے کچھ حصّوں میں اب بھی یہی طرزِ تعمیر مقبول ہے ۔

اٹھارہویں صدی میں جیسے جیسے برطانوی نو آبادیاں پھیلتی پھولتی گئیں ۔ چرچ ۔ سرکاری عمارتیں، اور نجی گھر بڑے اور خوبصورت ہوتے گئے ۔ عمارت بنانے والوں نے لکڑی ۔ سرخ اینٹ اور کبھی کبھی مقامی پتھر کے استعمال میں برطانیہ کے جارجین اسلوب کو اپنایا ۔ وسطی دروازہ بنانے اور اس کے اوپر بڑی کھڑکی کی

"گلف سٹریم" ـــــ ونسلو ہومر ۱۸۵۶-۱۹۱۰ء کی ایک ڈرامائی تصویر

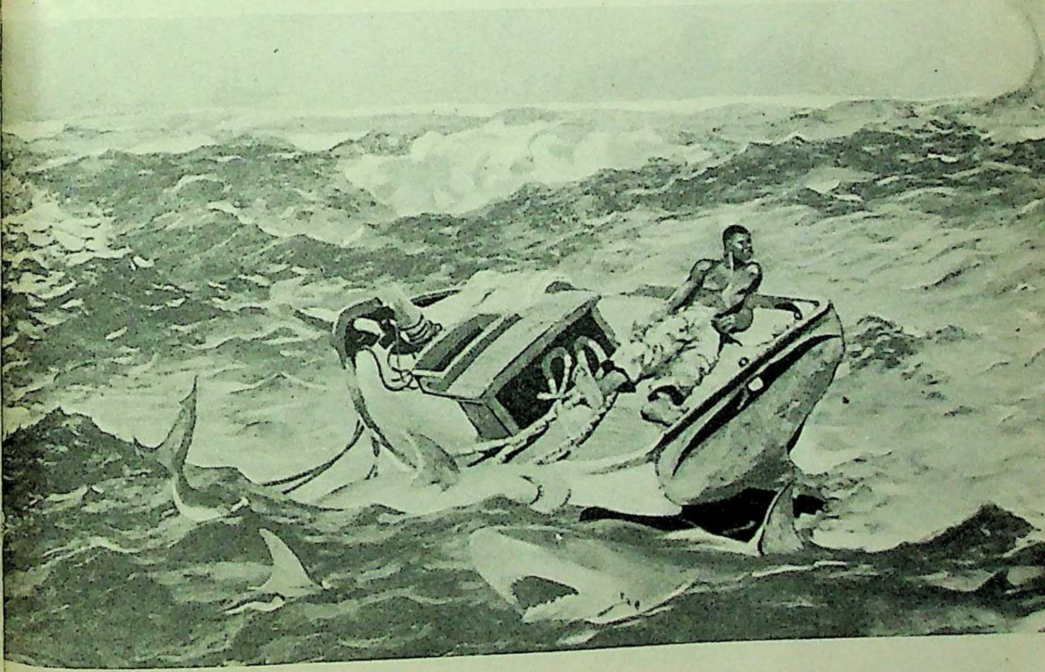

تعمیر کرنے میں نہایت محنت کی جاتی تھی۔ اور جمالیات کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا تھا۔ چرچوں کے کلس اُونچے اور اُونچے ہوتے گئے۔ ان پر کوئی خاص نمائندہ آرٹ کا اثر نہیں پڑا۔ بلکہ ان کی خوبصورتی کا انحصار لکڑی کے فنکارانہ استعمال میں ہے۔

ری پبلیکن کا ابتدائی دَور فنِ تعمیر بھی اسی طرح رومن تھا۔ جیساکہ یہ سیاست میں تھا۔ ٹامس جیفرسن جب فرانس گئے تو انہیں نائمز کے مقام پر مائی سن کاری کا مندر بے حد بھایا۔ اسے سیزرز نے بنوایا تھا۔

ورجینا کے دارالسلطنت۔ ورجینا کی یونیورسٹی اور جیفرسن کے اپنے گھر مونٹی سِلو میں اس مندر کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ تمام ریاستوں میں جس قدر سرکاری یا گھریلو عمارتیں بن رہی ہیں، ان میں کلاسیکی ڈیوڑھیاں اور یونانی ڈیزائن عام دکھائی دیتے ہیں۔ چاہے مالکان مکان نے لکڑی کا استعمال کیا ہو، یا پتھر کا۔ واشنگٹن کے دارالسلطنت میں رومن طرزِ تعمیر خاص طور پر نظر آتا ہے۔ اس کا نقشہ ایک فرانسیسی نے بنایا تھا۔ اور اب بھی یہ ورسیلز Versailles کی یاد دلاتا ہے۔

انیسویں صدی کی باقی ماندہ مدّت میں عمارتوں کا اسلوب محض کلاسیکی طرز کی نقالی تک ہی محدود نہ رہا۔ گوتھک۔ رومنیسک اور رینے سانس قسم کے تمام اسلوبوں کو استعمال کیا جانے لگا۔ اکثر اوقات تو غلط قسم کے مسالے لگا کر۔ اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ غلط قسم کے مقصدوں کے لیے۔ ذاتی سنکی پن کو عمارتوں کی تعمیر میں کھل کھیلنے کا موقع مِلا۔ اور اگر اب بھی آپ کا گزر پُرانے امریکی شہر میں سے ہو، تو آپ کو عجیب و غریب قسم کی عمارتیں نظر آئیں گی۔

امریکی فنِ تعمیر نے سکائی سکریپروں میں اپنی اختراع کے اظہار کا بہترین موقع پایا۔ یہ فلک بوس عمارتیں اِس لئے وجود میں آئیں کہ پُرہجوم شہروں میں زمینوں کے کرائے بہت بڑھ گئے تھے اور دوسری جانب عمدہ لفٹیں بن گئی تھیں اور لوہے اور فولاد کو عمارتوں کی تعمیر میں بہتر طور پر استعمال کرنے کے ڈھنگ معلوم ہو گئے تھے۔ اوّلین اُستاد لوئی ہنری سُلی وَن تھا۔ جس نے لوہے اور فولاد کو خوبصورتی کے ساتھ اپنی مرضی کی عمارتیں بنانے میں استعمال کیا۔ اس کے شاگرد فرینک لائیڈ رائٹ نے اپنے اُستاد سے بھی بڑھ کر اختراعی قوت کا اظہار کیا۔

فرینک لائیڈ رائٹ اس صدی کا سب سے بڑا معمار تھا۔ اور امریکہ کے شہروں کی بدصورتی اور شور و شر کا بہت بھاری نکتہ چین۔ اُس نے ۶۰ برس تک فنِ تعمیر کے نہایت دلیرانہ تجربے کئے۔ ہر بار جب اسے کوئی عمارت تعمیر کرنے کیلئے کہا جاتا تو وُہ اسے ایک نئی چیز پیدا کرنیکی دعوت خیال کرتا۔ اور اس کی تعمیر میں، ضرورت۔ مسالے۔ مقامِ عمارت اور مالکان کے مزاج اور علاقہ کی روایات، سب کو یک جان کر دیتا۔

رائٹ اور یورپ زاد فنِ تعمیر کے ماہرین مثلاً والٹر گروپی اس۔ اہیرو سارینن اور لڈوگ مائز وان ڈر اوہی کی رہنمائی میں حالیہ برسوں میں امریکی فنِ تعمیر میں حیران کن تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ جو دلچسپ کام ہوا ہے، وُہ اکثر فیکٹریوں اور دوسری کمرشل عمارتوں کی تعمیر میں ہُوا ہے۔ مثال کے طور پر

جاز سنگیت کا سرکردہ امریکی ماہر لوئیس آرم سٹرانگ (باجہ بجاتے ہوئے)

نیویارک سٹی کی سی گرام اور لیور عمارتیں پیش کی جا سکتی ہیں، جو اس قدر دیو قامت اور چمکدار ہیں اور ان کے سامنے کے رُخ میں مستطیل گلاس لگا ہُوا ہے۔

امریکہ کے آج کے ماہرین میں ایڈورڈ ڈی سٹون بھی بہت مشہور ہیں۔ ان کے ذاتی اور مخصوص قِسم کے اسلوب نے موجودہ دَور کے کاروباری اور صاف ستھری عمارتوں کی جگہ گزشتہ دَور کی مینا کاری اور نقاشی کو رواج دیا ہے۔ نئی دِلّی میں امریکہ نے جو عمارت اپنے سفارت خانہ کیلئے بنائی ہے۔ اس کے بنانے والے یہی صاحب ہیں۔

علاوہ ازیں پرائیویٹ عمارتیں بنانے میں نئی قِسم کے مسالے اور کئی ڈیزائن نہایت ہوشیاری کے ساتھ استعمال ہوتے رہتے ہیں۔

مصوّری

اوّلین آبادکار چونکہ نچلے متوسط طبقہ سے آئے تھے۔ اور ان میں سے اکثر کا تعلق پروٹسٹنٹ مذہب سے تھا۔ لہذا امریکہ میں لطیف فن آہستہ آہستہ ترقی پا سکے۔

چرچوں نے قدیم بائیبل کا حُکم مانتے ہوئے اپنے ہاں منقش تصاویر نہیں رکھیں۔ عام طور پر ان گرجا گھروں میں کوئی نقش و نگاری نہیں ہوتی تھی۔ اور نہ کوئی مجسمے رکھے جاتے تھے۔ ہاں دوسری قِسم کی خوبصورتی کا انتظام کر دیا جاتا تھا۔

اٹھارہویں صدی کے اواخر میں جب خوشحال تاجروں نے برطانیہ کے جارجین اسلوب کی عمارتیں بنوائیں تو اُنہیں یہ خواہش بھی ہوئی کہ جس طرح برطانیہ میں لوگوں کی تصویریں بنی ہیں۔ اسی طرح ان کی اور ان کے خاندانوں کی تصویریں بنائی جائیں۔ ایک مقامی سکول کا آغاز ہوا۔ اور اُس کے لیڈر بنجمین ولیسٹ اور جان سنگل ٹن کوپ لے۔ یورپ اور امریکہ دونوں جگہ اُستاد تسلیم کئے جانے لگے۔

انیسویں صدی کے ابتدا کے رومانوی دَور میں یورپ اور مقامی فنکاروں کو امریکہ کی شاندار سینری اور سرحدی لوگوں کی رنگ آمیز زندگی سے بہت دلچسپی پیدا ہوئی۔ فرانسیسی نژاد جان جیمز اڈوبون نے امریکی پرندوں کی نہایت پیاری پیاری تصویریں شائع کیں۔ جرمنی کے کارل بوڈمر نے ریڈ انڈین کی زندگی کی تصویریں کھینچیں۔ ان میں ایک تصویر ایک قتلِ عام کی بھی تھی، جسے بوڈمر نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ دوسرے مصوّروں نے جن میں جارج سی بنگھم بھی تھا۔ مخصوص سرحدی نظاروں کی تصویریں بنائیں۔ انہوں نے انیسویں صدی کے دو اعلیٰ ترین امریکی مصوروں یعنی حقیقت پسند ونسلو ہومر اور تھامس ایکنس کے لئے راستہ ہموار کیا۔

۱۸۴۰ء کے بعد سے کیریر اینڈ ایوس کمپنی نے لیتھوگراف کی رنگین مقبولِ عام تصویریں بھاری تعداد میں فروخت کرنا شروع کر دیں جس سے امریکیوں کو اپنے وطن کی رنگین اور گوناگوں زندگی سے پوری طرح شناسائی ہو گئی۔ اس فرم کی جاری کردہ فوٹو کی نقول اب تک مقبولِ عام ہیں۔

فوٹو گرافی جیسے ہی شروع ہوئی، امریکہ میں اس کا بہت رواج ہو گیا۔ میتھیو براڈی نے سرکار کی امداد سے خانہ جنگی کی تصویریں دورانِ جنگ لیں۔ اس کی المناک اور دِل پذیر فوٹو گرافی نے امریکیوں کو جنگ سے ایک حد تک متنفر کرنے میں اہم پارٹ ادا کیا ہے۔

انیسویں صدی کے اواخر میں امریکہ کے کروڑپتیوں نے اپنے خاندان کی تصویریں بنوانے کیلئے اس وقت کے مشہور مصوّروں کی خدمات حاصل کیں۔ ان میں ایک مصوّر جان سنگر سارجنٹ بھی تھا۔ ان امرا نے یورپ سے ہر دَور کے نمونہ ہائے فن کی خرید بھی شروع کر دی۔ اس قسم کی چیزوں کی خرید دیکھا دیکھی باعثِ عزّت بنکر رہ گئی۔ لیکن کچھ عرصہ گزرنے پر ان تمام تصویروں وغیرہ کو قومی عجائب گھروں کو دیدیا گیا۔ اور اب نیویارک سِٹی کا مٹروپولیٹن میوزیم آف آرٹ اور واشنگٹن کی نیشنل گیلری کا تو ذکر ہی کیا یورپ کے بڑے بڑے عجائب گھروں کے مقابلہ میں جہاں تک کہ یورپی اور ایشیائی آرٹ کی چیزوں کی موجودگی کا تعلق ہے بہت سے امریکی شہروں کے عجائب گھر پیش کئے جا سکتے ہیں۔

۱۹۱۱ء میں آرموری شو، نام کی تصویروں نے اِس قدر اثر پیدا کیا کہ سی زانی اور وان گوگ کے نئے یورپی آرٹ

اور فرسانہ اور باطن نگارانہ طرزِ مصوّری سے امریکی عوام روشناس ہو گئے۔

قبل ازیں ہی مقامی مصور کئی قسم کے تجربات کر رہے تھے اور جذباتی ہو یا حقیقت پسندانہ وُہ اپنے انفرادی طرز پیدا کر رہے تھے۔ ان کے احاطہ میں کیسی شئے کی رواجی تصویر کشی سے لیکر مقامی نظاروں کی شاعرانہ تادیل تک سبھی کچھ آتا تھا جس طرح کہ ہم تمام ادیبوں کا ذکر نہیں کر پائے۔ اسی طرح اس مختصر سے جائزہ میں تمام مصوروں کا بیان تو کیا ہو گا ہم ان کے نام بھی نہیں گنوا سکتے۔ یہاں جگہ کہاں ہے کہ ہم تھامس بنٹن اور گرانٹ وڈ کے ان جذبوں کا ذکر کریں، جن کی بنا پر انہوں نے وسطی مغرب کی دیہاتی زندگی کی نقاشی کی ہے۔ یا کہ یہ بتائیں کہ وُہ کون سی رُوح تھی، جس نے جان سلون ایجی نالڈ مارش۔ جارج بیلوز اور بن شاہن کو شہروں کی گھما گھمی کی زندگی کی تصویریں کھینچنے پر اکسایا دوسری جنگِ عظیم کے بعد سے جدید امریکی مصوروں کی تصویروں میں زیادہ تر نام نہاد تصوراتی باطن نگاری کا نمایاں اثر دکھائی دیتا ہے۔ ان مصوروں کی اکثر تصویریں تمام تر اپنی ہی قسم کی ہیں۔ اور ان کے اثر کا انحصار ان کے خیالی خوبصورت ڈیزائن یا بُرش۔ حرکت اور رنگ کے جذباتی اظہار پر ہوتا ہے۔ اس قسم کی تقاطری، یا عملی نقاشی فنی طور پر جائز ہے۔ اس پر زیادہ بحث مرحوم جیکسن پولک کی تصویریں سامنے رکھ کر کی گئی ہے۔

پیشہ ور مصوروں کے علاوہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں لاکھوں لوگ شوقیہ مصوری کرتے ہیں۔ یہ لوگ

واشنگٹن میں پوٹومیک دریا کے پاس کھُلی فضا میں ایک محفلِ موسیقی

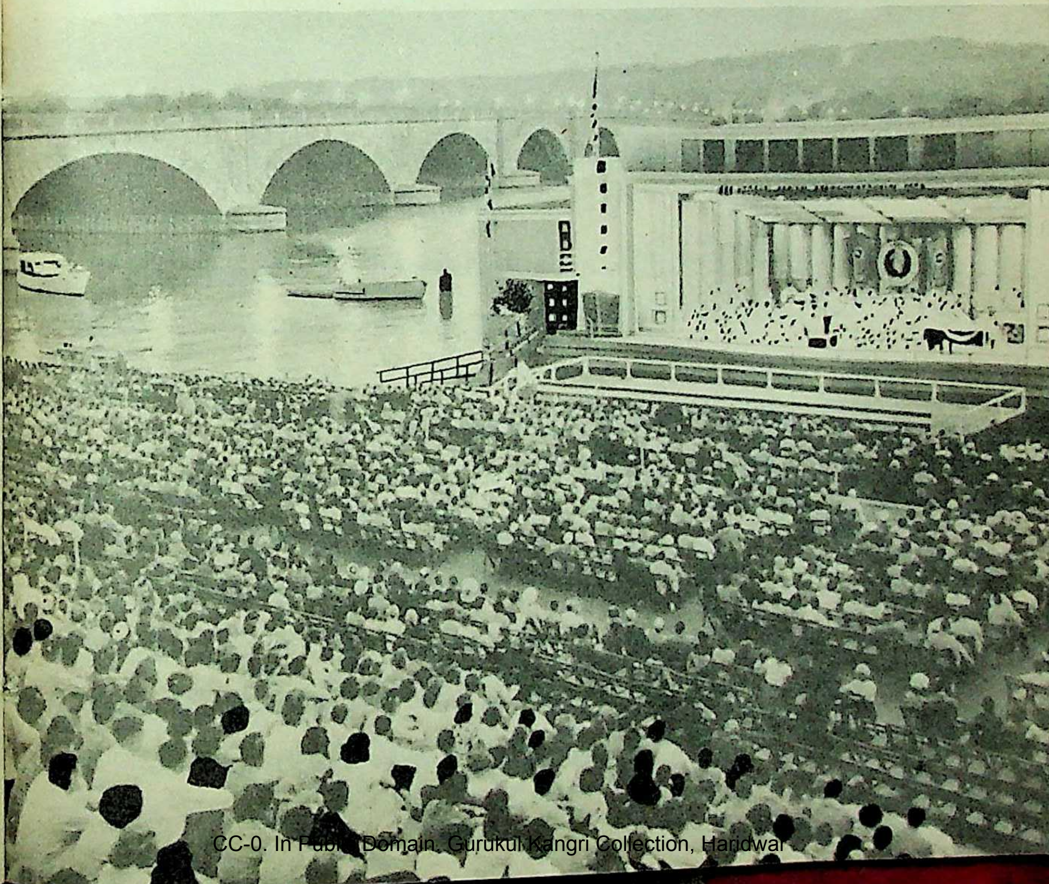

میوزیم کے سکولوں یا کالجوں میں مصوری کے خاص کورس کی تربیت لیتے ہیں۔ ایسے رسائل بھی عام ہیں۔ جن کی اشاعت لاکھوں تک پہنچے اور جو اکثر اوقات ہر دور اور تہذیب کی عمدہ نقاشی کے نمونوں کی رنگین تصویریں شائع کرتے رہیں۔

موسیقی

امریکہ کا جو سنگیت دُنیا بھر میں سب سے زیادہ مشہور ہے وہ بلاشبہ ’جاز‘ ہے۔ اس کا آغاز اس صدی کے اوائل میں نیو اورلینز کے نیگرو سٹریٹ بینڈز سے ہُوا۔ انیسویں صدی کے دوران میں نیو اورلینز امریکہ کا ایک ایسا شہر تھا جس میں سب سے زیادہ غیر ملکی رسم و رواج موجود ہوں۔ اس کے ناچ گھروں میں یا میلوں پر جو موسیقی سُنی جاتی تھی وُہ فرانسیسی ہسپانوی۔ ولیسٹ انڈنوی۔ امریکی اور افریقی اثرات کی حامل تھی۔ ماہرینِ موسیقی اِس امر پر متفق نہیں ہیں کہ ’جاز‘ پر مذہبی رقص اور کام کے وقت نیگرو جو ناچ ناچتے تھے اور جسے وہ افریقہ سے اپنے ساتھ لائے تھے، براہ راست کسقدر اثر پڑا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ ’جاز‘ بے حد جمہوری اور ذاتی قسم کا مظہر ہے — اس کے ساز انسانی آوازوں کی نقالی کرتے ہیں اور باہم بولتے ہیں۔ سازندوں کے سامنے کوئی لکھے ہُوئے اشارے نہیں ہوتے۔ ہر بار ایک نیا ہی راگ نکلتا ہے۔ ٹرمپٹ یا بلیوز سنگر کو کلیرنیٹ یا ٹرام بون بجانے والا جواب دیتا ہے اور یہ تمام سازندے ایک طاقتور مترنم پسِ منظر کا خیال رکھتے ہیں۔

نیگرو کے روحانی گیتوں پر ظاہر ہے کہ مغربی یا عیسائیت کا اثر پڑا ہے۔ اوّلین دور کے پیوری ٹن اور پروٹسٹنٹ قبیلے عام طور پر نہایت جوش سے دُعائیہ گیت گایا کرتے تھے۔ امریکہ میں جو پہلی کتاب شائع ہُوئی اُس میں سامز Psalms مقفّٰی شعروں میں تھے تاکہ یہ آسانی سے گائے جا سکیں۔ اے وینجلیکل فرقوں کے کیمپوں میں دعاؤں کو نہایت جوش سے گایا جانے لگا۔ اور کبھی کبھی ٹولیاں ایک ایک گیت کو سوالاً جواباً گاتی تھیں۔ نیگرو کے گیتوں میں جو نیگرومی زبان میں ہیں انہی کے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔

گزشتہ صدی بھر سے امریکہ میں جو گیت مقبول چلے آ رہے ہیں، ان میں سٹیفن فوسٹر کے یہ گیت بھی ہیں: ”اوسوسانہ“ ”اولڈ بلیک جو“ اور ”اولڈ فوکس ایٹ ہوم“۔ یہ گیت لکھے تو ایک سفید فام نے لیکن ان میں جنوبی کھیتوں پر کام کرنے والے نیگروؤں کے جذبات کی عکاسی ہے۔

ان کے علاوہ جو گیت عام طور پر گائے جاتے ہیں۔ ان میں شمالی کارولینا۔ کین ٹوکی اور ارکنساس کے کوہ پیماؤں کے گیت ہیں، یا ان گیتوں کی کچھ بدلی ہوئی دُھنیں۔ اصل میں یہ انگلش یا سکاٹش بیلیڈ ہیں۔ لیکن صدیوں تک ایک سے دوسرے مغنّی کو زبانی پہنچنے کی وجہ سے بہت بدل گئے ہیں۔ مغرب کے چرواہے بھی انہی لوک گیتوں کی دُھنوں کو اپنا کر اپنی تنہائیوں اور خطرناک زندگیوں کا ذکر کرتے آئے ہیں۔ آہستہ آہستہ دیہاتی رقصوں کے ساتھ گیت اور ساز بھی شروع ہو گئے۔

امریکہ میں مخصوص طبقے کا خصوصی سنگیت بہت آہستہ رونما ہوا۔ فنونِ لطیفہ کی طرح اس کا آغاز بھی نوآبادکاروں میں جماعتیں رونما ہونے۔ سکولوں کی قلّت اور سرپرستوں کی عدم موجودگی نیز موسیقی کی کوئی روائت نہ ہونےکی بنا پر ہُوا۔ امریکہ کا اعلیٰ سنگیت کلچر بین الاقوامی ہے۔ انیسویں صدی میں مشہور غیر مُلکی موسیقاروں نے امریکہ کا نہایت کامیاب دورہ کیا۔ بیسویں صدی میں بہت سے امریکہ میں رہنے کیلئے آ گئے۔ یا یہاں رہ کر انہوں نے اپنا بہترین کام سرانجام دیا۔ ان میں مندرجہ ذیل بھی تھے۔ مِسٹراونسکی۔ بار ٹوک۔ شوان برج۔ ڈِس کے نینی اور کوسی وٹسکی۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ میں موسیقی کا معیار نہایت سخت ہے۔

۱۹۴۰-۵۰ میں مختلف سنجیدہ سنگیت محفلوں میں حاضرین کی تعداد میں ۸۰ فیصد اضافہ ہُوا۔ اور اسی عرصہ میں پہلے سے دوگنے شہروں میں باقاعدہ موسیقی گھر قائم ہُوئے۔ ۱۹۵۱ء تک امریکہ میں ۶۵۹ موسیقی گھر بن چکے تھے۔ محض ۱۹۶۰ء میں امریکن سمفونی آرکسٹرا لیگ نے فن کے ۱۱۱۳ مظاہرے کئے۔ بہت سے پبلک سکولوں میں عمدہ تربیت یافتہ بینڈز اور آرکسٹرا ہیں۔

۱۹۴۹ء کے سنگیت ناٹک "ساؤتھ پیسفک" کا ایک منظر جس میں مشہور موسیقار ایزیو پنزا (بائیں اوپر) اور کامیڈین میری مارٹن (دائیں) نظر آرہے ہیں ——

اکثر لبرل آرٹس کالجوں میں عملی موسیقی کی تربیت کے کورس پڑھائے جاتے ہیں۔ امریکہ میں ایسے بہت شوقین ہیں جنہیں ہائی۔ فائی پسند ہو۔ یعنی جو اپنے موسیقی سُننے والے آلات کی نہایت تیز موسیقی پر فخر کرتے ہوں۔ ان شوقین حضرات کا معیار بہت بلند ہوتا ہے، اور یہ اپنے لئے نہایت احتیاط سے موسیقی کے ریکارڈ چُنتے ہیں۔ اب تو ڈسک پر تمام قسم کا، اور تمام زبانوں کا سنگیت میسر آنے لگا ہے۔

اس خوشگوار ماحول میں بہت معیاری قسم کے موسیقاروں نے نشو ونما پائی ہے۔ ان میں راجر سیشنز، ورجل تھامسن۔ رائے ہیرس۔ رینڈل تھامسن۔ ہاورڈ ڈہینس اور سیمول باربر بھی ہیں۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے، کہ مخصوص امریکی اشیا کے استعمال سے موسیقی کے بہت سے تجربے کئے گئے۔ خاص طور پر اس دور میں جبکہ آزاد مشرب موسیقی کار اینٹونن ڈوورک نے نیو ورلڈ سمفنی لکھی تھی۔ جن لوگوں نے ایسے تجربات کئے ہیں۔ ان میں جارج گرشون اور ایرون کوپلینڈ بہت مشہور ہیں۔ اوّل الذکر کی شہرت "ریپسوڈی ان بلیو"۔ "پورگی اینڈ بیس" اور "این امریکن اِن پیرس" کی بنا پر اور کوپلینڈ کی اپنے بیلے "بلی دی کِڈ"۔ "روڈیو" اور "اپالاچین سپرنگ" کی بنا پر ہوئی۔

تھیٹر

امریکی تھیٹر نے اوکلاہوما اور ساؤتھ پیسفک کو سنگیت کا رُوپ دیکر اس ضمن میں اپنا خاص کام کیا ہے۔ امریکہ کے میوزیکل مزاحیہ کھیل یورپ کے اوپراؤں ایسے ہوتے ہیں۔ خاص طور پر وائنا کے مزاحیہ اوپراؤں سے۔

ان پر غنائی ناٹکوں اور امریکہ کے گیت بھرے کھیلوں کا خاص اثر پڑا ہے۔ امریکہ کے گیت بھرے تماشے گیتوں۔ ناچوں اور مذاقوں سے بھرے ہوئے تھے۔ اور ان کا انحصار نیگروؤں کی نقل پر ہوتا تھا، جو سفید فام لوگ لگاتے تھے۔

موسیقی زا مذاحیہ کھیلوں میں مقامی نظاروں۔ رواجوں اور لوک گیتوں کا بہت مؤثر استعمال کیا جاتا ہے۔ جی روم کرن اور اوسکر ہیمر سٹین کے شو بوٹ Show Boat میں دریائے می سس پی کی اس زندگی کے چند رنگین پہلوؤں کا اظہار جو سٹیم بوٹ کے زمانے میں ممکن تھی۔ جارج گرشیون سٹرائیک اپ دی بینڈ اور آف دی آئی سنگ میں امریکہ کی سیاسی زندگی کا مذاق اُڑاتے ہیں۔ گرشیون نے پورگی اینڈ بیس کے گیتوں کو لکھنے سے قبل ساؤتھ کیرولینا کے مقام چارلی سٹن میں کچھ دن وہاں گزارے، جہاں نیگرو رہتے تھے۔ اس کھیل میں آپ کو کسی بڑے اوپرا کی جذباتی گہرائی اور عمدہ موسیقی ملیگی۔ اس نئے میدان میں مقبول ترین موسیقی بھرے کھیل رچرڈ راجرز اور اوسکر ہیمر سٹین نے تیار کئے۔ اوک لاہوما کا چربہ گرین گرو' دی لائی لاکس سے اُتارا گیا ہے۔ جو جنوب مغرب کے گوالوں اور کاشتکاروں کی زندگی سے متعلق ہے۔ انہی دو حضرات نے ساؤتھ پے سیفک تیار کیا۔ جس میں جنگ کے دوران ایک نرس کا ذکر ہے اور اس طرح انہوں نے مِلکر دی کنگ اینڈ آئی بھی لکھا۔ جس میں ایک انگریزی گورنس شاہِ سیام کے دربار میں جاتی ہے۔ کول پورٹر کا ڈرامہ کس می کیٹ شکسپیئر کے ڈرامے ٹیمنگ آف دی شریو سے لیا گیا ہے اور لرنر اور لوویو نے مائی فیئر لیڈی کا پلاٹ جارج برنارڈ شا کے ڈرامہ پگ می لیون سے لیا ہے۔ ان تمام گیت بھرے کھیلوں کے ناچ۔ گانے اور سٹیج کے سازوسامان ڈرامے کے موضوع کے مطابق ہوتے ہیں۔ اور یہ موضوع عام طور پر سنجیدہ ہوتا ہے۔ امریکہ کے جدید ناچ نے جن کا آغاز الیسا ڈورا ڈنکن اور اوتھ سینٹ ڈنس نے کیا۔ اور جسے مارتھا گراہم اور ڈورس ہمفری نے جاری رکھا۔ عوامی تفریحی ناچوں پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔

اِن موسیقی زا ناٹکوں کو چھوڑ کر نیویارک میں جب تھیئٹروں کا موسم آتا ہے تو ایسے ہی کھیل تماشے ہوتے ہیں، جیسے کہ یورپ کے عام بڑے شہروں میں۔ امریکہ کے ڈرامہ نویس خاص طور پر یوجین اونیل۔ تھارنٹن ولڈر، ٹینیسی ولیمز اور آرتھر ملر بیرون ممالک میں بھی خاصے مشہور ہیں۔ نیویارک کے مقابلہ میں دوسرے بڑے شہروں میں کوئی اوّل درجہ کا پیشہ وارانہ تھیئٹر نہیں ہے۔ ماضی میں بہت سے شہروں میں تھیئٹر کمپنیوں کی جو کبھی کبھار ڈرامے کھیلتی تھیں، امداد کی جاتی تھی۔ لیکن وُہ سینما گھروں کا کامیابی سے مقابلہ نہ کر پائیں۔ یہاں تک کہ خود نیویارک میں ایسی تربیت یافتہ تھیئٹر کمپنیوں کو برقرار رکھنا مشکل ہو رہا ہے، جو سنجیدہ قسم کے ڈرامے کھیلیں۔

نیویارک کے بڑے بڑے تھیئٹروں میں چونکہ کرائے اور مزدوری زیادہ ہے۔ لہٰذا پیشہ ور پروڈیوسرں کی یہ تمنا ہوتی ہے۔ کہ ان کے ڈرامے بہت زیادہ کامیاب ہو کر لمبے عرصے تک چلتے رہیں۔ ان مشکلوں کے باوجود "براڈوے سے دور" قسم کے تھیئٹر چل نکلے ہیں۔ جہاں تجرباتی یا دوسری قسم کے ضروری کھیلوں کو ایک خاص چیدہ حاضری کے سامنے پیش کیا جا سکتا ہے۔ اور اس پر خرچ بھی کم اُٹھتا ہے۔ بہت سے آرٹس کالجوں میں اچھی قسم کے تھیئٹر ہوتے ہیں۔ اور اکثر چھوٹی بڑی جماعتیں شوقین کھلاڑیوں کے لئے اپنے ہی تھیئٹروں کا انتظام

کرتی ہیں۔ موسم گرما کی تفریح گاہوں میں سینکڑوں تھیئٹر کمپنیاں جن میں پیشہ ور ایکٹر ہوں۔ یا زیر تربیت اور شوقین حضرات کام کرتے ہوں۔ کھیل تماشے دکھاتی ہیں۔ موسم گرما میں شکسپیئر کے ڈراموں کی خاص تقریبوں میں بہت سے اچھے ناٹک سامنے آتے ہیں۔

متحرک تصویریں۔ ٹیلی ویژن اور ریڈیو

امریکہ کی متحرک تصویریں دُنیا بھر میں اِس قدر مشہور ہیں کہ ان پر کوئی طویل بحث کرنا بیکار سی بات ہوگی۔ بدقسمتی سے اکثر غیر ممالک میں جو فلمیں دِکھائی جاتی ہیں۔ وُہ ہماری دوسرے درجے کی فلمیں ہوتی ہیں، یا مارپیٹ کی لرزہ خیز داستانیں۔ اور ہر انسان اِس بات پر متفق ہوگا۔ کہ امریکہ میں زندگی کا جو صحیح ڈھب ہے، اس کی نہایت بھدی شکل یہ فلمیں پیش کرتی ہیں۔

امریکہ میں جو ڈرامے یا ناول کامیاب رہتے ہیں، ان کو عام طور پر متحرک تصویروں میں تبدیل کر لیا جاتا ہے۔ اگرچہ متحرک امریکی تصویروں میں خاص قسم کی تیزی اور ڈھنگ سے کام لیا جاتا ہے۔ اور اس میں زیادہ تر امریکہ کے نظاروں اور سماجی حالات کی تصویر کشی ہوتی ہے۔ لیکن جہاں تک کرداروں کا تعلق ہے، وُہ ہر مُلک کے ہوتے ہیں۔ بہت سے ڈائرکٹر بھی یورپین ہیں، مثلاً یو بی سٹیش۔ اور اسی طرح گریٹا گاربو۔ چارلی چپلن اور آڈری ہیپبرن بھی یورپی ہیں۔

ٹیلی ویژن کے مقابلہ میں ریڈیو کو اِس قدر نقصان نہیں پہنچا۔ جیسا کہ خیال کیا جا سکتا تھا۔ امریکہ کے اکثر گھروں میں ٹیلی ویژن سیٹ ہیں۔ چونکہ ٹیلی ویژن پر عوامی تفریح کے ایسے کھیل دکھائے جاتے ہیں، جن پر بہت خرچ آتا ہے۔ لہٰذا ریڈیو سٹیشن اب اپنا وقت بہتر ریکارڈ بجانے یا دوسری قِسم کی سنجیدہ گفتگو نشر کرنے میں صرف کر سکتا ہے۔

اکثر شہروں میں صبح سویرے شروع ہو کر رات گئے تک ٹیلی ویژن کے پروگرام ہوتے رہتے ہیں۔ ایک وقت میں ۴ سے ۱۲ پروگرام ہو رہے ہوتے ہیں اور سُننے والے جو پروگرام چاہیں، چُن کر سُن لیں۔ اکثر یہ انتخاب کا میدان نہایت اعلیٰ ہوتا ہے۔ سردیوں میں اتوار کو بیلے۔ اوپرا۔ شکسپیئر کا ڈرامہ۔ اعلیٰ سیاست دانوں کے درمیان بحث۔ سائنسدانوں کے درمیان مناظرہ۔ اہم سماجی معاملوں پر ڈاکومینٹری فِلم اور سازوں پر اعلیٰ قِسم کی موسیقی کا پروگرام پیش ہوتا ہے۔

اخبارات اور رسائل

امریکہ کے اخبار بہت ضخیم ہوتے ہیں۔ اتوار کو اُن کے سو سو صفحے ہوتے ہیں۔ بہت سے صفحے تو بہت بڑے بڑے اشتہاروں سے پُر ہوتے ہیں۔ باقی ماندہ صفحات پر زیادہ تر مختلف قِسموں کے فیچر ہوتے ہیں۔ جن میں گھر کی دیکھ بھال اور خوبصورتی کے رازوں سے لیکر مزاحیہ کالم۔ گپ شپ اور سیاسی تبصرے سبھی کچھ ہوتے ہیں۔ اکثر فیچر سین ڈی کیٹڈ ہوتے ہیں۔ اِس سے مراد یہ ہے کہ کچھ فرمیں کچھ مضامین کو بہت سے اخباروں کے ہاتھ بیچ دیتی ہیں، جو اُنہیں ایک ہی دِن شائع کرتے ہیں۔

سین ڈی کیٹڈ سیاسی مبصرین نہایت آزادانہ طور پر لِکھتے ہیں اور وُہ بڑے شہروں کے سرکردہ اخبار کے

امریکہ میں اخبار فروشی کا ایک پُرہجوم اڈہ جو غیر مُلکی سیاحوں کے لِئے باعثِ کشش ہے

خاص سیاسی مبصرین کی مانند بے حد اثر انداز ہوتے ہیں۔ اخباروں کے مالک عام طور پر قدامت پسند قِسم کے تاجر ہوتے ہیں۔ لیکن وُہ اپنے اخبارات میں ایسے سیاسی نظریات بھی شائع کرتے ہیں، جن سے وُہ خود متفق نہ ہوں۔

جب فرینکلن روزویلٹ اور ہیری ٹرومین صدارت کیلئے کھڑے ہُوئے تھے تو اکثر مالکانِ اخبار، اور ایڈیٹوریل لکھنے والوں نے ان کی مخالفت کی۔ لیکن اکثر پولیٹیکل رپورٹروں نے ان کی حمایت کی۔ امریکی صدر ہر ہفتے ایک پریس کانفرنس کرتے ہیں۔ جہاں وُہ اخبار نویسوں کے زبانی سوالات کا جواب دیتے ہیں۔ ٹیلی ویژن کے پروگراموں میں رپورٹروں سرکاری افسروں سے انٹرویو لیتے ہیں۔ اور اکثر سخت قِسم کے سوالات کرتے ہیں۔ تحقیقاتی کمیٹیوں کے روبرو جو شہادتیں آتی ہیں اور ان کے علاوہ جو سیاسی نکتہ چینی ہوتی ہے، ان کو تفصیل کے ساتھ شائع کرتے ہیں۔ اخبارات حکومت کی اس ضمن میں مدد کرتے ہیں کہ وُہ ایماندار اور چوکس رہے۔

نجی ملکیت میں ہونے نیز مُکمل آزاد ہونیکی بنا پر اخبارات جو مواد چھاپتے ہیں اور جو معیار پیش کرتے ہیں، وُہ بہت مختلف ہوتا ہے۔ وُہ کِسی بھی اچھے کام کی حمایت کرنے میں بھی جرأت دکھا سکتے ہیں۔ وسیع پیمانے پر فروخت ہونیوالے "مختصر اخباروں" میں زیادہ تر جرائم اور سماجی خرابیوں کا ذکر ہوتا ہے۔ "دی نیویارک ٹائمس" اہم خبروں کو زیادہ اچھی طرح چھاپنے میں غالباً دُنیا کا سب سے بڑا اخبار ہے۔ بعض اوقات اس اخبار میں ایسے مسودے شائع ہوتے ہیں، جو ۱۰ سے ۲۰ ہزار الفاظ پر مشتمل ہوتے ہیں۔

اخبارات کے بعد ہفتہ وار رسائل کا نمبر آتا ہے۔ مثلاً 'ٹائم' - اور 'نیوز ویک'۔ یہ ہفتہ وار اخبارات ہفتہ کی خبروں کے علاوہ سائنس۔ مذہب۔ تعلیم اور دوسرے فنون کا ایک چابکدستانہ خلاصہ پیش کرتے ہیں۔ اپنے مخصوص انداز کا ایک ہفتہ وار اخبار 'دی نیویارکر' بھی ہے۔ اس میں سنجیدہ کہانیاں۔ سماجی حالات۔ نہایت پُر مزاح کارٹون اور پُر مغز ایڈیٹوریل چھپتے ہیں۔ اپنے اپنے انداز میں 'ٹائم' اور 'نیویارکر' امریکیوں کی اس محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ جو انہیں محاورہ۔ عامیانہ زبان۔ لفظوں کے ہیر پھیر۔ کنایہ واشارہ اور رنگین عبارت سے ہے۔ 'ریڈرز ڈائی جسٹ' سب سے زیادہ چھپنے والا رسالہ ہے۔ اس میں ایک خاص سیکشن ایسا ہے جو محاکاتی زبان استعمال کرتا ہے (ایسی زبان جو آنکھوں کے سامنے کسی منظر کا نقشہ کھینچ دے) ان کے علاوہ 'گڈ ہاؤس کیپنگ'۔ 'لیڈیز ہوم جرنل'۔ 'میک کالز' اور 'دی سیٹر ڈے پوسٹ' کی طرز کے گھریلو پسند کے مقبول عام میگزین بھی ہیں۔

۱۹۵۷ء میں امریکہ میں ۳۹ رسائل تھے۔ جن کی اشاعت دس دس لاکھ سے زیادہ تھی۔ آج کل ایسے ۴۰ رسائل ہیں۔ جن کی اشاعت دس دس لاکھ سے زیادہ ہے۔ ان رسائل میں افسانوں اور ہلکے پھلکے مزاحیہ مضامین کے ساتھ ہی فیملی اور سماجی مسائل پر سنجیدہ قسم کے مضامین بھی ہوتے ہیں۔ ان میں سے اکثر مضامین نہایت آسان لفظوں میں نفسیات' اور سماجیات کی اس تعلیم کا عملی استعمال کرتے جاتے ہیں۔ جو یونیورسٹیوں میں پڑھائی جاتی ہے۔

اخبار فروشی کے اڈے پر کھڑا ہوا کوئی غیر ملکی جب رسالے اور اخبار دیکھتا ہے تو شاید اسے امریکی کلچر کی غلط تصویر نظر آتی ہے۔ بڑے طمطراق سے جو میگزین پھیلائے ہوتے ہیں' وہ اکثر سنسنی قسم کے ہوتے ہیں۔ غالباً اس غرض سے کہ راہی انہیں دیکھکر ٹھٹھک جائے۔ امریکی ایسے رسالوں کے امکانی نقصانات پر اکثر بحث کرتے ہیں۔ لیکن پریس کی آزادی پر کسی قسم کی پابندی لگانیکے وہ سخت خلاف ہیں۔ صاف اور صریح فحاشی البتہ قانون کے تحت جُرم قرار دی گئی ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص کسی اچھی پبلک لائبریری میں یا کالج میں جائے اور کثیر التعداد رسالوں کو دیکھے' جو بہت زیادہ موضوعات پر نکلتے ہیں' تو یقیناً اس پر اچھا اثر پڑیگا۔ اس جگہ وہ دیکھیگا کہ نہایت اعلیٰ ذہنی مواد موجود ہے جس سے نہ صرف ماہرین بلکہ عام لوگ بھی فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ رائے عامہ کے ہفتہ وار رسائل میں 'دی نیشن'۔ 'دی نیوری پبلک'۔ 'دی نیو لیڈر'۔ 'دی نیشنل ریویو' اور 'دی سیٹر ڈے ریویو' ہیں۔ اس قسم کے کچھ رسالے مذہبی گروہ شائع کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر 'کامن ویل' کیتھولک لوگوں کا ہے۔ 'اور کرسچین سنچوری' پروٹسٹنٹ والوں کا۔ 'کومنٹری' اہلِ یہود پر اکثر مضامین شائع کرتا ہے لیکن وہ تمام بنیادی سماجی سوالات پر بھی لکھتا رہتا ہے۔

'اٹلانٹک منتھلی' اور 'ہارپرز میگزین' دو ایسے رسالے ہیں' جو اچھے پڑھے لکھے لوگوں کے معیار پر پورے اُترتے ہیں' اور ان کا روئے سخن بھی عام پسند کے میگزین پڑھنے والوں کی نسبت انہی اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کی طرف ہے۔ سماجی اور ثقافتی مسائل پر اعلیٰ قسم کی بحث کا جہاں تک تعلق ہے۔ اسے شائع کرنے میں 'دی یال ریویو'۔ 'پارٹی زن ریویو' اور 'امریکن سکالر' کا نام لیا جا سکتا ہے۔ یہ سہ ماہی رسالے ہیں۔ 'فارن آفریز' میں بین الاقوامی مسائل پر ایسے مضامین شائع ہوتے ہیں' جو خاص طبقے کو بھی پسند آئیں اور عوام کو بھی۔ امریکہ آنے والوں کو ادبی اور علمی سہ ماہی رسالوں مثلاً 'کن یان ریویو'۔ 'ہڈسن ریویو' اور 'سوانی ریویو' کا بھی مطالعہ کرنا چاہیئے۔ امریکہ کے اگر سائنسی اور اعلیٰ علمی رسالوں کا نام ہی لیا جائے تو کئی صفحات درکار ہوں گے۔

کُنبہ

امریکہ میں عورتوں کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ ابتدائی دِنوں میں مردوں کے مقابلہ میں بہت کم عورتیں آئی تھیں اور جو آئیں، اُن میں سے اکثر زچگی یا دوسری تکلیفوں سے جانبر نہ ہو سکیں۔ ان کی قلّت نے انہیں اسقدر توقیر دلا دی۔ کہ ان کی بہنوں کو یورپ میں میسّر نہ تھی۔ حالانکہ امریکہ میں زندگی بہت سخت تھی۔ انیسویں صدی میں ایک سیاح نے یہ کہا تھا کہ "امریکہ میں مرد کام کرتے ہیں اور عورتیں حکومت"۔ صنفِ نازک ہونیکی وجہ سے ان کے تقریباً سب مرد مویشی پالنے۔ جنگلات صاف کرنے اور صنعتوں کی ترقیوں میں مصروف رہتے تھے۔ لیکن ایسے میں ابتدائی دَور کے امریکہ کے کلچر اور فنونِ لطیفہ کی حفاظت کا کام عورتوں کے ذمہ آیا۔

کالیج کی تعلیم اور شہری آبادی کے بڑھنے سے کلچر کے بارے میں پُرانا نظریہ بدل گیا ہے بلکہ اس میں وسعت پیدا ہو گئی ہے۔ بڑے بڑے کارپوریشن اپنے افسران کو لبرل آرٹس کے کورس پڑھنے کیلئے رخصت دے دیتے ہیں (اکثر ان کی بیویوں کو بھی) اور یہ رخصت کئی کئی ماہ تک کی ہوتی ہے۔ بعض اوقات ایک برس تک کی لیکن اس کے باوجود کلچرل سرگرمیوں مثلاً ناچ گانوں کی محفلوں یا لیکچروں کا زیادہ تر انتظام عورتیں ہی کرتی ہیں۔ خاص طور پر وُہ عورتیں جو گھر کے کام کاج سے آزاد ہو چکی ہیں۔ یہ وہی کلب کی عورتیں ہیں، جن کا ذکر رضاکار انجمنوں کے باب میں آ چکا ہے اور جنہوں نے امریکی زندگی کے معیّار کو بلند کرنے میں بہت کام کیا ہے۔

کام کاج کے اوقات کم ہونے اور آسانی سے سنبھل جانے والے گھروں کی تعمیر نے کُنبہ کے مختلف افراد کو زیادہ گہرے ربط رکھنے کی ترغیب دی ہے۔ گھر کے کام کاج کی تعمیری سرگرمیوں۔ چرچ اور کمیونٹی کی کاروبار اور ٹیلی ویژن کے پروگراموں میں سے کچھ ایسی باتیں ڈھونڈ نکالی جاتی ہیں۔ جن سے کُنبہ کے تمام افراد دلچسپی لے سکیں۔ لیکن کنبوں کے افراد جس بات سے بہت مطمئن ہوتے ہیں، وُہ کھُلی ہوا کی زندگی ہے۔ شہروں کے نواح میں لاکھوں امیر خاندان رہتے ہیں۔ انہوں نے باغات بنا رکھے ہیں، جن میں زیرِ آسمان انگیٹھیاں بھی ہیں۔ ان مقامات پر یہ امیر خاندان اپنے دوستوں کو تفریح اور پکنک کیلئے مدعو کرتے ہیں۔ ان موقعوں پر عموماً مرد کھانا پکاتے ہیں۔ اور اپنی خاص چیزوں کو اپنے مہمانوں کے سامنے رکھتے ہیں۔ گرمیوں کے دِنوں میں ایک عام امریکی کُنبہ موٹر کار میں سوار ہو کر سیر کیلئے جائیگا۔ یا کِسی دریا یا پہاڑ کے قریب ایک کرائے کے مکان میں چھُٹیاں گزارے گا۔ یا کسی ریاستی یا قومی پارک میں کیمپ لگا کر پڑا رہیگا۔ سردیوں میں بھی بعض خاندان سنیچر وار کو قریب کے پہاڑ پر چلے جائیں گے۔ اور

ایک امریکی کنبہ جس نے گرمائی تعطیلات میں ایک کیمپ لگا رکھا ہے

برف میں کھیلیں گے۔ اور اگر لمبی رخصت ہوئی تو جنوب میں گزاریں گے۔

امریکی خاندان جو اکثر باہم کام کرتا ہے، ماں باپ اور بچوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ باپ۔ دادا۔ چچے چچیاں۔ اور چچا زاد یا ماموں زاد بھائی بہنیں عام طور پر ملک کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوتے ہیں۔ یا سمندر پار رہتے ہیں اور کرسمس یا یوم شکرانہ کے موقع پر آپس میں ملتے ہیں۔

نئی پود چھوٹی عمر میں شادی کر رہی ہے اور اپنے بابا داد کے مقابلہ میں زیادہ بچے پیدا کر رہی ہے۔ غالباً اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ کالج سے نکلتے ہی اب ہر شخص کو بہتر آمدن کا موقع مل جاتا ہے۔ علاوہ ازیں دوسری جنگِ عظیم کے بعد سے امریکیوں میں ماں باپ بننے کی خواہش زیادہ ہو گئی ہے۔ اس رجحان کے باوجود اکثر بیاہتا عورتیں کام کرتی ہیں۔ چونکہ عورت اور مرد دونوں ہی ملازم ہوتے ہیں۔ لہذا گھر کی دیکھ بھال میں مرد بھی عورت کے شانہ لبشانہ کام کرتا ہے اور بہت سے بچے گھر کی ذمہ داریاں سنبھال لیتے ہیں۔ گھر ایک لحاظ سے تمام کنبہ کے مشترکہ کام کا میدان بن جاتا ہے۔

یورپ اور ایشیا کے مقابلہ امریکی گھر میں خلوت زیادہ بھی ہے، کم بھی۔ چونکہ ملازمتوں کی اجرتیں زیادہ ہیں اور ان کو دوسرے زیادہ اچھے کام بہ آسانی مل جاتے ہیں۔ اس لیے بہت کم امریکی گھروں میں ملازم رہتے ہیں۔ قدرتی بات ہے کہ عورتیں محنت بچانے والے طریقوں۔ پیکٹ میں بند خوراک، یا منجمد چیزوں پر زیادہ سہارا رکھتی ہیں۔ اور کبھی کبھار سخت قسم کا کام اجرت دے کر کروا لیتی ہیں۔ لیکن مہمان نوازی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ امریکی دوسروں کو اپنے ہاں مدعو کرنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ بچوں کے دوست کھلے بندوں ادھر ادھر دوڑتے پھرتے ہیں اور نوجوان ماؤں کی بے تکلف کافی کی دعوتوں سے لیکر آٹھ سے دس مہمانوں کی غور و خوض سے تیار کی ہوئی پارٹیاں آئے دن کی باتیں ہیں۔

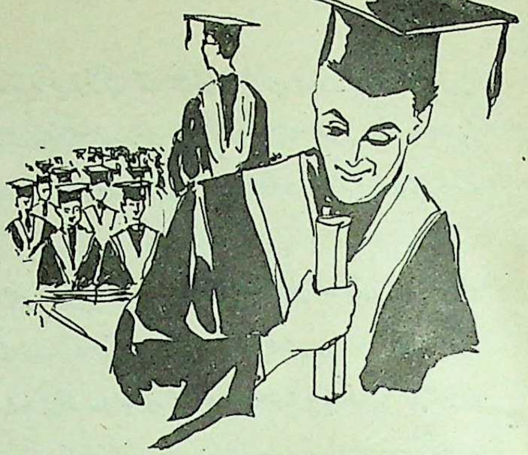

ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں تعلیم

۱۶۳۰ء میں جونہی پیوریٹن میساچوسٹس بے کالونی میں آئے، اُنہوں نے ایک کالج اور کئی سکول قائم کر دیئے۔ بوسٹن کا لیٹن گرامر سکول ۱۶۳۵ء میں قائم ہُوا، اور ہارورڈ کالج ۱۶۳۶ء میں۔ پیوریٹن مذہب جو مشاہدۂ باطن اور بلندیٔ ذہن کا قائل ہے، اِس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ اس کے پادری اور اس کے پیروکار دونوں ہی لکھے پڑھے ہوں۔ ۱۶۴۷ء میں میساچوسٹس کی منظم اسمبلی نے یہ حکم دیا۔ کہ جس شہر میں ۵۰ کُنبے فرد کش ہوں، وہ ایک اُستاد کی پرورش کا انتظام کرے۔ اور جہاں ایک سو خاندان بستے ہوں، وُہ ایک گرامر سکول قائم کرے۔

دوسری نوآبادیوں میں بھی اِسی طرح کی تحریک کام کرتی رہی اور ۱۷۷۶ء کے انقلاب کے رونما ہونے تک امریکہ میں ۹ کالج تھے — جو زیادہ تر مذہبی گروہوں یا ذہین افراد نے جرأت کر کے بنائے تھے۔ مثال کے طور پر نیو ہیون۔ کونیکٹی کٹ میں ییل کالج Yale College ان لوگوں نے قائم کیا، جن کے خیال میں ہارورڈ کے کالج میں مذہبی تعلیم راسخ الاعقیدہ طرز کی نہیں رہی تھی۔

انقلاب کے بعد اعلیٰ تعلیم کے مواقع کو بڑھانا بہت اہم ہو گیا تھا۔ آئین کے مصنفین میں سے ایک نے کہا تھا " ان لوگوں کو جو حکومت کا کاروبار اپنے ہاتھ میں ہی رکھنا چاہتے ہیں، یہ لازم ہے کہ اس طاقت کو حاصل کریں، جو علم سے آتی ہے۔ شہری آزادیوں کی صحیح بُنیاد تعلیم سے ہی رکھی جا سکتی ہے۔ ۱۸۲۰ تک تیس مزید پرائیویٹ کالج قائم ہو چکے تھے اور آٹھ عوامی یونیورسٹیاں بھی۔ خانہ جنگی کے وقت تک مزید ۲۰۰ پرائیویٹ کالج بن چکے تھے۔ اور ان کے ساتھ ہی سرکار نے مزید ۱۳ یونیورسٹیاں قائم کر دی تھیں۔

امریکہ میں عام طور پر ‘کالج’ اور ‘یونیورسٹی’ سے مراد ایک طرح ہی کے تعلیمی ادارے ہوتے ہیں۔

۱۸۱۹ء میں سپریم کورٹ نے یہ فیصلہ دیا تھا۔ کہ جن کالجوں کو پرائیویٹ طریقے سے قائم کیا گیا ہے۔ اور جن کے اخراجات عوام دیتے ہیں، اور وہی ان کا انتظام کرتے ہیں۔ ان میں سرکار کو مداخلت نہیں کرنی چاہیئے۔ نیو ہیمپشائر میں دارٹ ماوتھ کالج ایک پرائیویٹ ادارہ ہے، جو نوآبادیاتی دِنوں سے چلا آ رہا ہے اور جس کو قائم کرنے کی اجازت شاہِ انگلستان نے ایک حکم کے تحت دی تھی۔ نیو ہیمپشائر کی قانون ساز اسمبلی نے اسے سرکاری یونیورسٹی بنانے کا فیصلہ کیا۔ لیکن سپریم کورٹ نے اسے ایسا کرنے سے روک دیا۔

یہ بہت اہم فیصلہ تھا۔ اس فیصلے نے پرائیویٹ امداد سے چلنے والے تعلیمی اداروں کو سرکاری قبضہ میں

جانے سے بچا لیا۔ اور ساتھ ہی اس فیصلے سے سرکار کو یہ خیال آگیا۔ کہ اسے اپنے طور پر یونیورسٹیاں قائم کرنی ہوں گی۔ ۱۸۶۲ء میں کانگرس نے ایک قانون منظور کیا جس سے تعلیمی ادارے قائم کرنے میں مزید مدد ملی — یعنی ریاستوں کو سرکاری زمین دیدی گئی، تاکہ وُہ لینڈ گرانٹ کالج بنائیں۔ ان اداروں میں زراعت اور مشینوں کے فن کی خاص تعلیم دی جاتی ہے۔

دریں اثنا —— ۱۷۷۶ء اور ۱۸۶۱ء کے درمیان یعنی انقلاب اور خانہ جنگی کے درمیان سیکنڈری سکول بننے لگے۔ ۱۸ویں صدی میں ہی یوں تو لیٹن گرائمر سکولوں کے خلاف غیر اطمینانی کا اظہار ہونے لگا تھا۔ اور کہا جانے لگا تھا کہ بہت کم لوگوں کو کلاسیکی علوم کی بہت محدود تعلیم دی جاتی ہے اور اِس طرح بہت کم بچے کالج میں تعلیم پانے کے اہل ہوتے ہیں۔ بنجمین فرینکلن نے سیکنڈری سکول کا ایک پلان بنایا۔ اس سکول میں ایسی تعلیم و تربیت دینے کا انتظام کیا جانا تھا، جو تاجروں۔ انجنیئروں۔ کارخانہ داروں اور دوسرے لوگوں کے کام آسکے —— انگریزی ادب۔ سائنس اور تاریخ کی تعلیم کا بھی انتظام کیا جانا کورس میں شامل تھا۔ آخر کار انہی تجویزوں کو انقلاب کے فوراً بعد عملی صُورت دی جانے لگی۔ اور کئی سکول قائم ہو گئے۔ ۱۸۶۰ء کے لگ بھگ ایسے ۶ ہزار سکول تھے۔

ان تعلیمی اداروں کی کچھ کچھ سرکار بھی امداد کرتی تھی اور مستحق طلباء کو وظائف بھی دیئے جاتے تھے۔ لیکن ان کو غیر جمہوری کہا جانے لگا۔ کیونکہ یہ اپنی زیادہ توجہ طلباء کو محض کالجوں کیلئے تیار کرنے کی طرف دیتے تھے۔ ۱۸۲۰ء کے بعد سے ان اداروں کا مقابلہ سرکاری سکولوں سے بھی ہونے لگا۔ چونکہ سرکاری سکولوں میں تعلیم کے بہتر انتظامات ہوتے اور زیادہ قِسم کے مضامین پڑھائے جاتے تھے۔ بہت سے پرائیویٹ تعلیمی ادارے یا تو بند ہو گئے یا وُہ سرکاری سکولوں میں مِل گئے۔ لیکن چند ایک ادارے مثلاً ایگزسٹر اکیڈمی۔ انڈوور اکیڈمی۔ ہوچ کس۔ گروٹن۔ لارنس وِل اور سینٹ مارکس ابھی تک قائم ہیں اور کُلّی طور پر آزاد اور پرائیویٹ ہاتھوں میں ہیں۔ حال ہی میں کچھ نئے سکولوں کا بھی اضافہ ہُوا ہے، جن میں سے پٹنی اور ڈالٹن ایسے غیر روایاتی قِسم کے سکول بھی ہیں۔

ان میں سے اکثر سکول تو ایسے ہیں، جہاں طلبا دِن رات ہی رہتے ہیں۔ لیکن بڑے شہروں کے نزدیک جو سکول ہیں، ان میں صبح کے وقت طلبا پڑھ کر واپس گھروں کو چلے جاتے ہیں۔ ان کو پریپریٹری سکول بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ اپنی توجہ اِس بات پر مرکوز رکھتے ہیں کہ ان کے طلبا کالجوں اور یونیورسٹیوں میں داخل ہونیکے قابل بنائے جائیں۔ یہ سکول وقف کے ہوتے ہیں۔ یعنی کسی عالم یا مخیر حضرت نے ان سکولوں کو چلانے کیلئے ورثہ چھوڑا ہوتا ہے۔

ان میں کچھ ایسے طلبا بھی داخل ہوتے ہیں، جنہیں وظائف مِلتے ہوں۔ لیکن زیادہ تر فیس ادا کرنے والے طلبا ہی پڑھتے ہیں۔ اور یہ فیس کافی زیادہ ہوتی ہے۔ قدرتی بات ہے کہ اُونچے متوسط خاندانوں کے لڑکے ہی زیادہ تر ان سکولوں میں پڑھتے ہیں اور اس طرح سے جماعتی گروہ بندی کا رجحان پیدا ہوتا ہے۔ اگرچہ سکولوں کی یہ پوری کوشش رہتی ہے کہ طبقہ بندی کو جس قدر ہو کم کیا جائے۔

لیکن سرکاری سکولوں میں کوئی فیس نہیں ہوتی۔ اور جس علاقے میں یہ ہوتے ہیں، وہاں کے پرائمری پاس طالب علم اُن میں تعلیم پا سکتے ہیں۔ ۱۹۰۰ء میں امریکہ کے جن بچوں کی عمر ۱۴ اور ۱۷ سال کے درمیان تھی، ان میں سے

محض پندرہ فیصد سیکنڈری یا ہائی سکولوں میں تعلیم پا رہے تھے۔ لیکن گزشتہ دس بیس برس میں اِسی عمر کے طلبا کی تعداد ۷۵ فیصد ہوگئی تھی اور اس میں لگاتار اضافہ ہو رہا ہے۔ جو لڑکے کالجوں میں جانا چاہتے ہوں، یا ہائی سکول کے فوراً بعد کام کرلینا چاہتے ہوں۔ دونوں ہی ایک ہی طرح کے سکولوں میں تعلیم پاتے ہیں، اور ایک ہی قِسم کے کورس پڑھتے ہیں۔ یہ امریکیوں کی ایک سار تعلیمی منصوبہ بندی ہے جو دوگونہ قِسم کی تعلیم سے الگ ہے۔ جن ملکوں میں دو قِسم کی تعلیم ہوتی ہے، وہاں اعلیٰ تعلیم پانے والوں اور دوسروں کے درمیان تقسیم ناقابلِ تنسیخ ہو جاتی ہے۔ کبھی تو ۱۰ اور ۱۱ برس سے ہی اور اگر ایسا نہ ہو، تو آخر میں۔ لیکن امریکہ میں یہ دونوں قِسم کے گروہ ایک ساتھ رہتے ہیں اور کم تعلیم یافتہ گروہ کے لئے اعلیٰ تعلیم کے امکانات ہر عمر میں قائم رہتے ہیں۔

سرکاری سکولوں میں اور بہت سے پرائیویٹ ترقی یافتہ سکولوں میں کم از کم ابتدائی درجوں تک تو یہ ہوتا ہے کہ بچوں کو اچھے شہری اور سماج میں اپنا مقام پانے کے اہل بننے کی تعلیم پر اتنا ہی زور دیا جاتا ہے، جتنا کہ ذہنی اور علمی کامیابیوں پر۔ اُستادوں کو اِس امر کی تربیت دی جاتی ہے کہ وہ "بچے کو مکمل تعلیم دیں"۔ اور بچوں کے جو قدرتی رجحان اور جذبات ہوتے ہیں، ان کے مطابق قدم اُٹھائیں۔ اُستاد تصویروں۔ گروہی منصوبوں، اور عملی کام سے پڑھنے کے تمام طریقوں کو استعمال میں لاتے ہیں۔ ماہرینِ تعلیم اپنے طریقوں کی افادیت کی جانچ پڑتال کیلئے اکثر اوقات تجربے کرتے رہتے ہیں اور اس مقصد کیلئے بچوں کا علمی اور نفسیاتی امتحان لیا جاتا ہے۔ معلّموں کے تربیتی کالجوں میں بچوں کی نفسیات اور پڑھانے کے طریقوں کی تعلیم پر بھی اتنا ہی زور ڈالا جاتا ہے، جتنا کہ ان مضامین کی پڑھائی پر، جو معلّموں نے جاکر پڑھانے ہیں۔

چونکہ ہائی سکولوں کا مقصد بچوں کو اچھے شہری بنانا اور ان کی مکمل تعلیم و تربیت کرنا ہے۔ لہذا طلبا اور معلّموں کی زیادہ قوتیں غیر علمی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں صَرف ہوتی ہیں۔ ہائی سکولوں میں طلبا کی اپنی سرکاریں ہوتی ہیں۔ اپنے اخبار۔ ادبی رسالے اور سال کی کتابیں Year Books کلبیں ہوتی ہیں۔ جن میں سنگیت۔ ڈرامے۔ غیر ملکی زبانیں۔ بحث و مباحثے۔ فنونِ لطیفہ۔ مضمون نگاری۔ فوٹوگرافی اور اِس قِسم کے دوسرے کاموں کی عملی تعلیم دی جاتی ہے۔ اپنے اپنے تعلیمی محکموں کے تحت طلبا ہی ان تمام سرگرمیوں کا انتظام کرتے ہیں۔ اور ان کی دیکھ بھال انہی سے پاس ہوتی ہے۔ خیال یہ ہے کہ اِس طرح سے بچوں کو جمہوری نظامِ حیات کی عملی تعلیم دیکر انہیں ذمہ دار خود مختار حکومت کا انتظام سِکھایا جا رہا ہے۔

ریاستی اور پرائیویٹ یونیورسٹیوں میں ایسے اعلیٰ سائنس اور دوسرے مضامین کے معلّم ہیں، جو اعلیٰ ترین تعلیم پانے والے طالب علموں کی اچھی طرح تربیت کے اہل ہیں اور یہی بات بہت سے دوسرے چھوٹے کالجوں کے بارے میں صحیح ہے۔ جو سارے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں اور خاصے مشہور ہیں۔ دُنیا کے دوسرے خطوں سے بھی بہت سے اعلیٰ سائنسدان اور عالم امریکہ آکر پڑھانا پسند کرتے رہے ہیں۔ امریکہ کی اکثر لائبریریاں اور ٹیکنیکل محکمے نہایت قابلِ تعریف ہیں۔ لیکن ایک جگہ سے دوسری جگہ یا ایک ادارے سے دوسرے ادارے میں معیار مختلف ہوگا (لیکن اعلیٰ ہی رہے گا)۔

امریکہ میں اعلیٰ تعلیم کے تقریباً ۱۹۰۰ ادارے ہیں۔ یعنی یونیورسٹیاں۔ کالج۔ پیشہ ورانہ۔ سائینٹفک اور انجینئرنگ سکول۔ ٹیچنگ کالج اور دو سال کی تعلیم دینے والے ادنےٰ کالج۔ ان میں سے کچھ پرائیویٹ ہاتھوں میں ہیں اور کچھ سرکاری ہیں اور باقی ماندہ مِلے جلے انتظام کے۔

امریکہ کی اعلےٰ تعلیم کے بارے میں کوئی کلیہ قائم نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کسی مرکزی اتھارٹی کے تحت نہیں ہے۔ اکثر ادارے آزادانہ طور پر بنے اور انہوں نے اپنے طور پر ہی اپنے تعلیمی طریقوں اور اپنے کاروباری انتظام کا فیصلہ کیا۔ سرکاری یونیورسٹیوں کا انتظام بھی ایک بورڈ کے ذریعہ ہوتا ہے۔ جسے گورنر یا ریاستی قانون ساز اسمبلیاں قائم کرتی ہیں۔ جس ریاست میں یہ سرکاری یونیورسٹی ہوتی ہے، اس ریاست کے طلبا بہت کم فیس دیکر تعلیم حاصل کر سکتے ہیں اور بیرون ریاست کے طلبا کو زیادہ فیس دینا ہوتی ہے۔ پرائیویٹ اداروں کا انتظام ٹرسٹیوں کے ایک دائمی بورڈ کے ذریعہ ہوتا ہے۔ جس میں عموماً کچھ علما بھی ہوتے ہیں۔ ان کالجوں میں فیس بہت ہوتی ہے۔ لیکن مستحق طلبا کو بہت اچھے وظائف دیتے ہیں۔ ریاستی اور پرائیویٹ کالجوں کے تعلیمی معیار ان اداروں کی ضروریات سے پورا ہو جاتا ہے۔ جن کو کالجوں سے طلبا مِلتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ایک جگہ سے دوسری جگہ کے معیار میں کافی فرق ہوتا ہے۔ چیدہ چیدہ کالجوں میں داخلہ لینے کے لئے مُلک بھر میں ایک معیار کے انتخابات ہوتے ہیں اور ان امتحانات کے نتائج آزادانہ طور پر ممتحن بناتے ہیں۔

اکثر بڑے شہروں میں ان کے اپنے ہی پبلک کالج ہوتے ہیں۔ نیویارک شہر میں کم از کم پانچ ایسے کالج ہیں۔

ہم جو اصطلاحات استعمال کرتے آئے ہیں وُہ غیر واضح سی ہیں۔ اعلیٰ تعلیم ہائی سکول کی تعلیم نہیں ہوتی بلکہ اس سے مراد وہ تعلیم ہے جو طالب علم ہائی سکول سے کامیاب ہونے کے بعد یا پرائیویٹ پریپ سکولوں سے نکلنے کے بعد لیتے ہیں۔ گویا کہ اس عمر تک ایک طالب علم بارہ برس پڑھ چکا ہوتا ہے۔ اِسی طرح کالج اور یونیورسٹی کے ناموں کو گفتگو میں بلا تردد استعمال کر لیا جاتا ہے لیکن تعلیمی ادارے اپنے ناموں کے سِلسلے میں ایسا نہیں کرتے۔ عام طور پر کالج سے مراد ایسے ادارے ہیں جو طلبا کو بی اے یا بی ایس سی کی ڈگریاں حاصل کرنے کیلئے تعلیم دیتے ہیں۔ اس میں چار سال کی مدّت درکار ہے۔ ان کالجوں میں زیر تعلیم طلبا کو "انڈر گریجویٹس" کہتے ہیں۔ کالج کا کسی یونیورسٹی کا ایک حصّہ ہونا ضروری امر نہیں ہے۔

عام طور پر یونیورسٹی ایک ایسا ادارہ ہوتا ہے۔ جس میں کئی سکول یا "فیکلٹیز" ہوتی ہیں جو گریجوٹ کام کراتی ہیں۔ یعنی جو طالب علم بی اے یا بی ایس سی پاس کر چکے ہوتے ہیں، انہیں اعلیٰ ڈگریاں دلواتی ہیں۔ ایم اے کی ڈگری کیلئے عام طور پر ایک سال کا گریجوٹ کام درکار ہے۔ یہ دراصل درمیانی قِسم کی اور ایسی ڈگری ہے جس کی پوری طرح تشریح نہیں کیگئی اور یہ وہ لوگ حاصل کرتے ہیں، جنہیں سیکنڈری سکولوں میں پڑھانا ہوتا ہے۔ پی ایچ ڈی کی ڈگری پر تین سال کا گریجوٹ کام صَرف ہوتا ہے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھانے والے اکثر اُستادوں کیلئے یہ ڈگری ہوتی ہے۔ ایل، ایل، بی اور "ڈاکٹر آف ڈوِنٹی" کیلئے بھی تین تین سال درکار ہیں — جبکہ میڈیسن کے ڈاکٹر کیلئے چار سال۔

امریکہ میں طلبا کو اعلیٰ ڈگریاں لینے کیلئے پہلے کالجوں میں چار برس تک کام کرنا پڑتا ہے۔ لہٰذا یورپ کے طلبا کے مقابلہ میں یہاں طلبا اپنی پیشہ وارانہ تعلیم کو دیر سے مکمل کرتے ہیں۔ بی اے کی ڈگریاں فوری طور پر سُودمند یا پیشہ وری کے لئے کام نہیں آسکتیں۔ طلبا آرٹس اور سائنس کے مختلف کورسوں کی تعلیم سے اس کا آغاز کرتے ہیں۔ اسکے بعد

وہ اپنے منتخب پیشہ پر توجہ دیتے ہیں اور اس میں خاص مہارت حاصل کرتے ہیں۔ مثلاً حیاتیات سماجیات اور فرانسیسی ادب۔

غیر ملکوں کے رواج سے کہیں زیادہ امریکی طلبا کا اپنے پروفیسروں سے غیر رسمی تعلق رہتا ہے اور وہ اکثر ملتے رہتے ہیں۔ ان کے بہت سے نصاب سیمیناروں میں ہوتے ہیں جہاں کہ آزادانہ طور پر بحث ہوتی ہے۔ طلبا کو جو مضامین لکھنے کیلئے دیئے جاتے ہیں، ان کیلئے انہیں اس امر کی ترغیب دی جاتی ہے کہ وہ دیئے ہوئے مواد کا جسقدر ہو سکے آزادانہ جائزہ لیں اور اپنا نظریہ بنائیں۔

امریکی کالجوں کا بڑا مقصد یہ ہے کہ وہ لبرل آرٹس پروگرام پر چلتے ہوئے طلبا کو بی اے کی ڈگریوں کیلئے تیار کریں اور یہ ڈگری نہ صرف ان کیلئے درکار ہوتی ہے جو کسی پیشہ ور سکول میں جا رہے ہوتے ہیں۔ بلکہ ان کیلئے بھی جو براہ راست تجارت میں داخل ہو رہے ہوتے ہیں۔ لبرل آرٹس پروگرام کے تحت طلبا کو بنیادی سیاست اور فلسفہ کی اچھی تعلیم دی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں عام طور پر ہر طالب علم سے کہا جاتا ہے کہ وہ دوسرے ملکوں یا مختلف ادوار کے فنون کا گہرا مطالعہ کرے۔ امریکہ میں انڈر گریجویٹس کو جو تعلیم دی جاتی ہے۔ وہ اب امریکی یا مغربی یورپ کے کلچر تک محدود نہیں رہی۔ زیادہ سے زیادہ کالج ایشیا۔ مشرق وسطےٰ یا جنوبی امریکہ کے ملکوں کے مطالعہ کیلئے علاقائی پروگرام جاری کر رہے ہیں۔

بچے ایک مثالی امریکی قصبے کی لائبریری میں مطالعہ کر رہے ہیں

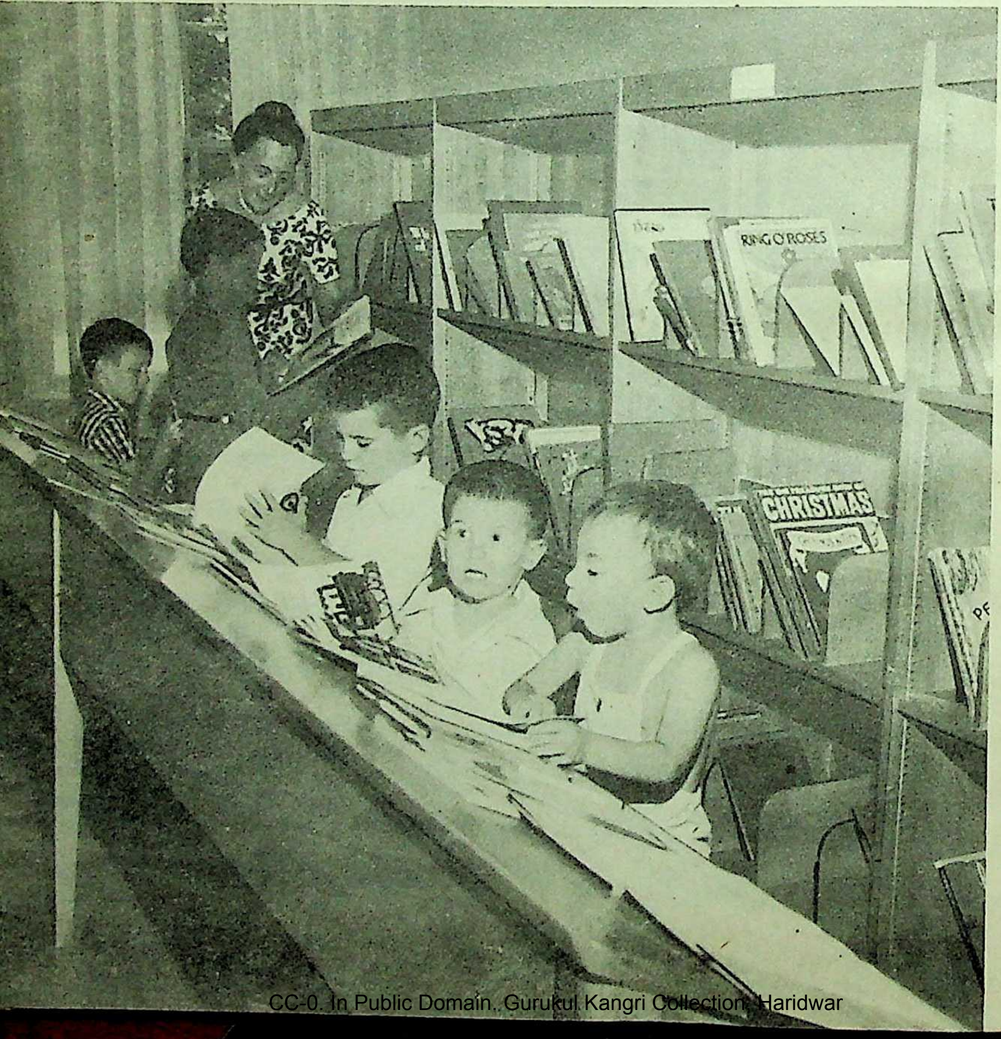

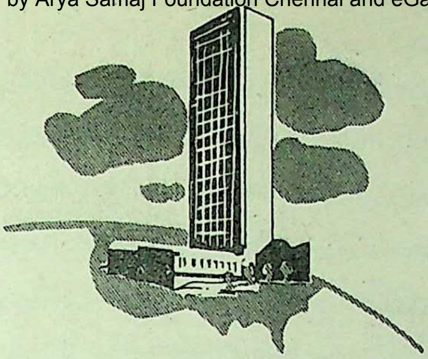

عالمی امُور میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ

غیر ملکی معاملات کی طرف امریکیوں کا مخصوص رویہ پیچیدہ اور اکثر متضاد ہوتا ہے۔ یہ اُن کی بین الاقوامیت اور جسے وُہ عدم مداخلت کا نام دیتے ہیں، دونوں کے امتزاج کا نتیجہ ہے۔

بین الاقوامیت کی طرف ان میں جو رجحان پایا جاتا ہے وُہ آسانی سے سمجھ آسکتا ہے۔ بہت سے امریکیوں کو اُن ممالک سے جہاں سے کہ وُہ آئے ہیں۔ یا اُن کے آبا و اجداد آئے تھے، جذباتی وابستگی ہے۔ مثلاً فنش امریکی چاہتے ہیں کہ فن لینڈ ایک آزاد مُلک کی حیثیت سے پھلے پھُولے۔ آئرلیش امریکی آئرلینڈ کے بارے میں بھی جذبات رکھتے ہیں۔ لیکن ان مخصوص نسلی رشتوں سے الگ ہٹ کر بھی امریکی اِس بات میں خلوص دِلی سے دِلچسپی لیتے ہیں کہ دُنیا بھر میں سیاسی اور اقتصادی ترقی ہو۔ اور ان سب سے بڑھ کر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ دو عالمی جنگوں نے امریکیوں کو جو تجربات دیئے ہیں اور ان جنگوں کے بعد جو حالات رونما ہُوئے ہیں۔ ان سے بھی امریکیوں کو یقین آگیا ہے کہ امریکہ عالمی امُور سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتا چاہے وُہ اُس کی کتنی ہی آرزو رکھتا ہو۔ عالمی مباحث میں امریکہ کو ایک بڑی طاقتور قوم ہونیکی وجہ سے اپنا حِصّہ تو لینا ہی ہوگا۔

امریکہ کی علیحدگی پسندگی کو سمجھنا یُوں تو آسان بات نہیں لیکن اس کے گہرے تاریخی وجُوہ ہیں۔ علیحدگی پسند عموماً جارج واشنگٹن کے الوداعی پیغام میں دی گئی نصیحت کو دہراتے ہیں۔ واشنگٹن نے کہا تھا "یورپ کے اپنے طے شُدہ مفادات ہیں جن کا ہم سے اگر کوئی تعلق ہے بھی تو بہت دُور کا۔" لہٰذا "ہمیں یورپ کے عام جوڑ توڑ سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہیئے۔"

امریکہ کے تیسرے صدر تھامس جیفرسن نے اِس بات کا اظہارِ تشکر کیا تھا۔ کہ مہربان قدرت اور بسیط سمندر نے امریکہ کو ایسی تباہی سے محفوظ رکھا جو ایک چوتھائی دُنیا کو درپیش ہے۔' ان کا اشارہ نپولین کی جنگوں سے تھا۔

امریکہ کی بُنیاد رکھنے والوں کے اگر اِس قِسم کے جذبات تھے، تو یہ بہت قدرتی تھے۔ یورپ کے تاجداروں کے درمیان جو جھگڑے پیدا ہُوئے، ان کی بِنا پر نو آبادیاتی حکومتوں نے امریکی براعظم پر چار تباہ کُن لڑائیاں لڑیں۔ تلاشِ آزادی کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ کہ اِن بکھیڑوں سے خلاصی ہو جائے گی۔ امریکیوں نے اپنی جنگِ آزادی میں بلاشُبہ فرانس سے امداد لی۔ لیکن جونہی وُہ آزاد ہُوئے۔ اُنہوں نے یورپ سے اپنی جغرافیائی علیحدگی کا جس قدر فائدہ

پہنچ سکتا تھا، حاصل کیا۔

علیحدگی پسندی چونکہ ایک حد تک جغرافیائی ہے۔ لہٰذا وہ لوگ جو اندرونِ مُلک رہتے ہیں۔ بحراوقیانوس اور بحرالکاہل کے ساحلوں پر رہنے والوں سے زیادہ علیحدگی پسند ہیں۔ اور یہ ایسا نظریہ ہے، جسے وہ انسان بہ آسانی سمجھ سکتا ہے، جس نے وسیع میدان کے، جو ختم ہونے کو نہیں آتا، ایک سرے سے دوسرے سرے تک سفر کیا ہو۔

نپولین کی جنگوں سے امریکہ کی یہ علیحدگی پسندی کی پالیسی کچھ وقت کیلئے ناکام ہوگئی۔ چونکہ برطانیہ نے امریکی جہازوں کو روک لیا تھا۔ اِس لئے امریکہ نے سنہ ۱۸۱۲ء کی غیر مقبول جنگ لڑی۔ لیکن اس کے بعد انیسویں صدی کے اختتام تک امریکہ یورپ کے جھگڑوں سے الگ رہنے میں کامیاب رہا۔ اِس بات نے اُسے نفسیاتی طور پر، بہت متاثر کیا ہے۔

علاوہ ازیں انیسویں صدی کے دوران میں امریکیوں کو سب سے بڑی چنتا یہ تھی کہ وہ کسی طریقے سے ان علاقوں کو متحد کرلیں، جو اُن کے ہاتھ میں ہیں۔ اور ان سب علاقوں کو اپنے ہاتھ میں لیں، جو اب سب مِلکر ریاست ہائے متحدہ امریکہ بنے ہیں۔

فرانس۔ سپین۔ انگلستان اور رُوس کے ساتھ پُرامن گفتگو کے ذریعہ اس وسیع براعظم کے اکثر علاقوں کو حاصل کیا گیا۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ پہلی عالمی جنگ میں بہت دیر کے بعد اور وہ بھی مجبوری کی حالت میں شامل ہُوا۔ جنگ کے مقاصد کا اعلان کرتے ہوئے، صدر ولسن نے اس امریکی اعتقاد کو پھر سے دہرایا تھا کہ امریکہ دُنیا بھر میں جمہوری خود مختار حکومتوں میں یقین رکھتا ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ ”دُنیا کو جمہوریت کے لِئے محفوظ بنانا چاہیئے۔ اور اُس کے امن کو سیاسی آزادی کی آزمودہ بُنیادوں پر قائم کرنا چاہیئے۔ ہم کوئی ذاتی غرض لیکر نہیں اُٹھے۔ ہم کِسی فتوحات کے خواہاں نہیں ہیں، اور نہ کِسی کو مغلوب کرنا چاہتے ہیں۔“

صدر ولسن کے قول کے مطابق پہلی عالمی جنگ کے خاتمہ پر سمجھوتے کے وقت ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے کوئی علاقہ نہیں لیا۔ اس کی بجائے امریکہ نے ان علاقوں کے لوگوں کو خوراک اور دوائیاں بھجوائیں، جو جنگ کی تباہ کاریوں کا شکار ہوئے تھے۔ دورانِ جنگ اور اس کے بعد بھی امریکی عوام نے ریلیف کے کاموں کیلئے بھاری رقوم بطور چندہ دیں۔ رُوس کو خاص طور پر بہت چندہ بھیجا گیا تھا۔

صدر ولسن نے قوموں کے حقِ خود اختیاری کے جِس اصول کا ذکر کیا تھا۔ اُس نے چیکوسلواکیہ اور یوگوسلاویہ ایسی نئی قومیں قائم ہونے میں بہت مدد دی۔ لیکن چند ووٹوں کی اکثریت سے امریکی سینٹ نے صدر ولسن کی اس تجویز کو مسترد کر دیا۔ کہ امریکہ لیگ آف نیشنز کا ممبر بنے۔ جنگ میں جو نقصان ہُوا۔ جزواً اُس نے امریکہ کو پھر سے علیحدگی پسندی کی طرف دھکیل دیا۔ علیحدگی پسندی کے جذبہ کی ایک نشانی یہ بھی تھی، کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں آنے والے لوگوں کی آمد پر شدید پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ ہر مُلک سے آنے والوں کی ایک محدود تعداد جِس کی بُنیاد ہر مُلک سے انیسویں صدی کے آخر تک آنے والوں کی تعداد پر تھی،

مقرر کر دی گئی۔

امریکی کارکنوں نے اس کوٹا سِسٹم کی حمایت کی۔ چونکہ اُنہیں خطرہ تھا کہ اگر جنگ سے تباہ شُدہ ممالک سے لوگ بھاری تعداد میں امریکہ چلے آئے تو اُن کی اُجرتوں پر بُرا اثر پڑے گا۔

پہلی عالمی جنگ کے بیس برس بعد تک امریکہ جذباتی طور پر خاصہ علیحدگی پسند رہا۔ اگرچہ وُہ بین الاقوامی کانفرنسوں میں شریک بھی ہُوا۔ اور اُس نے فاشی حملوں کے خلاف اجتماعی سلامتی کیلئے کام بھی کیا۔ نوجوانوں اور تعلیم یافتہ طبقہ میں جنگ کے خلاف بہت شدید جذبات پائے جاتے تھے۔ اور اگرچہ یہ لوگ فاشزم اور نازی ازم کے سخت خلاف تھے لیکن وُہ نہیں چاہتے تھے کہ امریکہ کِسی نئی جنگ کے لِئے ہتھیار بند ہو۔

صدر فرینکلن ڈی روزویلٹ نے اپنی پہلے دورِ صدارت میں غیر جانبداری کے قانون کی حمایت کی جِس کے تحت سپین کی خانہ جنگی میں امریکہ کو کِسی بھی پارٹی کی امداد کرنے سے روک دیا گیا تھا۔ ہالینڈ اور فرانس پر جب جرمنوں نے حملہ کیا، تو امریکی لیڈروں کے رویہ میں تبدیلی واقع ہُوئی۔ اب حکومت نے انگلستان اور فرانس کو فوجی سامان بطور عطیہ یا قرض دینا شروع کیا۔ اور جب جاپانیوں نے پرل ہاربر پر بمباری کی، اور جرمنوں نے امریکہ کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا، تو امریکی قوم نے اپنی تمام قوتیں جنگ کو فتح کرنے میں لگا دیں۔

لیکن جنگ ختم ہوتے ہی امریکہ نے پھر اِک بار جلد ہی فوجوں کو توڑ دیا۔ مگر اِس بار قوم کے دماغ میں علیحدگی پسندی کا خیال پہلے کی طرح جاگزیں نہیں تھا۔ لوگوں کو ایٹم بم کی تباہ کاریوں نے ڈرا دیا تھا۔ اور ہٹلر کے موت کیمپوں میں جو کچھ ہُوا۔ اُس سے وُہ مزید خوف زدہ ہو گئے تھے۔ اُن کا یہ عزم تھا کہ آئندہ ان باتوں کا اعادہ نہ ہونے دیا جائیگا۔ دوسری عالمی جنگ کے تجربہ نے انہیں وڈرو ولسن کے حق بجانب ہونے کا یقین دِلا دیا تھا۔

امریکہ اب مزید توقع نہیں کر سکتا تھا۔ کہ وہ عالمی معاملات سے الگ تھلگ رہ سکیگا۔ اب یہ امریکہ کا فرض ہو گیا تھا کہ وُہ اپنی طاقت اور اپنے آزاد اور جمہوری نظریوں کے مطابق عالمی سیاست میں کوئی پارٹ ادا کرے۔ سان فرانسیسکو میں امریکہ نے اقوام متحدہ کی بُنیاد ڈالنے میں سرکردہ کام کیا۔ اور نیویارک شہر میں اس کے مستقل مراکز بنائے جانے کا سواگت کیا۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے محض اقوام متحدہ کے ذریعہ ہی کام نہیں کیا، بلکہ اپنے طور پر بھی ان مُلکوں کو بھاری امداد دی، جو جنگ کے دوران میں تباہ حال ہو چُکے تھے۔ اور امریکہ اب بھی ایشیا اور افریقہ کے نئے آزاد ہونیوالے مُلکوں کو لگاتار امداد دے رہا ہے۔ تاکہ وُہ اقتصادی اور سماجی طور پر آگے بڑھیں۔ دوسری عالمی جنگ کے خاتمہ سے لیکر اب تک امریکہ ہر سال ۵۰۰ کروڑ ڈالر بطور امداد کے دیتا آیا ہے۔ اس رقم کا بیس فیصد تو قرضوں کی شکل میں دیا گیا۔ اور ۸۰ فیصد کُلی طور پر بطور عطیہ۔ امریکہ نے ہندوستان کو جو امداد دی ہے، اس میں قرضہ بھی ہے، اور عطیے بھی۔ مختلف معاہدوں کے تحت مارچ ۱۹۶۱ء تک امریکی سرکار نے ہندوستان کی سرکار کو جو رقوم دینے کا وعدہ کیا ہے۔ وُہ کُل ۳۸۰۰۰ لاکھ ڈالر یعنی ۱۸۰۹ کروڑ روپیہ بنتی ہے۔

امریکہ کی خارجہ پالیسی میں اگرچہ فوجی دفاع کا خیال کارفرما ہوتا ہے لیکن زیادہ زور اِس بات پر رہتا ہے کہ دوسرے مُلکوں کی اقتصادی صورتِ حالات کو بہتر بنایا جائے اور اُن کی آزادی محفوظ کی جائے۔

مارشل پلان نے جسے ۱۹۴۷ء میں بنایا گیا تھا۔ مغربی یورپ کے ممالک کو تیزی کے ساتھ خوشحال بنانے میں بہت ہاتھ بٹایا۔ ۱۹۵۰ء میں امریکہ کا نقطہ چار کا پروگرام شروع ہُوا۔ صدر ٹرومین نے اپنے افتتاحیہ خطاب میں جن چار نقطوں کا ذکر کیا تھا۔ غیر مُلکی امداد ان میں سے چوتھی تھی۔ اِس لئے اس پروگرام کا نام بھی نقطہ چار کا پروگرام پڑ گیا۔ لیکن کئی مُلکوں میں اُس کا اور نام بھی پڑا۔ ہندوستان میں اب وُہ "بین الاقوامی ترقیات کا امریکی مِشن" کے نام سے موسوم ہے۔

اِس پروگرام کے تحت صنعتی طور پر کم ترقی یافتہ مُلکوں کو فنی امداد دی جاتی ہے۔ تاکہ وہ جدید سائنس کا مؤثر استعمال کر پائیں۔ اِس غرض سے امریکہ کے زراعت۔ حفظانِ صحت۔ ادویات۔ انجینئرنگ اور دوسرے

نیویارک شہر میں اتحادی سبھا کے دفاتر اور اسمبلی کی عظیم عمارت

صنعتی میدانوں کے ماہرین غیر مُلکوں میں بھیجے جاتے ہیں، جہاں وُہ مقامی لیڈروں کی مدد کرتے ہیں اور اُن کے مسائل کو حل کرنے میں اپنے تجربات پیش کرتے ہیں۔ ان ماہرین کا خرچ خود امریکہ برداشت کرتا ہے۔

اکثر یہ سُننے میں آیا ہے کہ غیر مُلکوں کو امداد دینے میں امریکہ کا کوئی اپنا خود غرضانہ مقصد ہے۔ یہ اس لحاظ سے درست ہے کہ امریکیوں کو اب اچھی طرح احساس ہو گیا ہے کہ ہم سب ایک ایسی دُنیا میں رہتے ہیں جہاں ہم کہرے طور پر ایک دوسرے کے محتاج ہیں اور دُنیا بھر کی قوموں کی خُوشحالی ہی کسی ایک مُلک کی خُوشحالی کی ضامن ہو سکتی ہے۔

امریکہ کی تاجر فرمیں چاہتی ہیں کہ دُوسرے مُلکوں سے اُن کی تجارت نفع خیز ہو لیکن امریکی سرکار یہ توقع نہیں رکھتی، کہ جن مُلکوں کو وُہ امداد دے رہی ہے، وُہ اس کے بدلے امریکی تاجروں کو کوئی خاص مراعات دیں۔

امریکہ کی پالیسی انٹی کمیونسٹ ہے۔ لیکن یہاں بھی امریکہ کی مخالفت خود غرضانہ یا دفاعی نہیں۔ امریکیوں کا یہ وشواس ہے کہ انسان کے بہترین اوصاف جمہوریت میں ہی نمایاں ہوتے ہیں۔ چونکہ جمہوری نظام میں وُہ اپنی زندگیوں پر اثر انداز ہونیوالی پالیسیوں کا خود فیصلہ کر سکتے ہیں۔ اور ایسے نظام میں افراد کے حقوق پر حکمران اپنی من مرضی سے چھاپہ نہیں مار سکتے۔

دوسرے اکثر ممالک کی طرح امریکہ کی خارجہ پالیسی حقیقت پسندی اور آدرش واد کا مجموعہ ہے۔ لیکن جو شخص امریکی اخبارات کا مطالعہ کرتا ہے۔ یا امریکہ کی ایسی انجمنوں کے مباحثوں میں شریک ہوتا ہے۔ جہاں عالمی سیاست سے دِلچسپی لی جاتی ہو۔ یہ بخوبی جان جائیگا کہ امریکہ کی پالیسی میں آدرش واد کا طاقتور اور بھاری اثر پایا جاتا ہے۔

امریکیوں کو اِس بات کا احساس ہے کہ غیر مُلکوں میں اُن کے مُلک پر اور اُن کی پالیسیوں پر شدید نکتہ چینی ہوتی ہے، اور وُہ لوگ بھی نکتہ چینی کرتے ہیں، جن کی قومی خُوشحالی میں امریکہ نے بھاری بھرکم امداد دی ہوتی ہے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور دوسرے مُلکوں کے درمیان یقیناً ایسے سخت اقتصادی اور سیاسی مسائل موجُود ہیں جنہیں بہ آسانی حل نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن یہ مسئلے اِس طرح زیادہ آسانی سے سلجھ سکتے ہیں کہ امریکہ اور ان مُلکوں کے تعلقات میں خواہ مخواہ کی دشمنی نہ ہو۔ اور اس امر کا احساس رہے کہ ان میں مزاج کا کچھ قدرتی فرق ہے۔ علاوہ ازیں رواداری اور باہمی سوجھ بُوجھ سے کام لیا جائے۔ امریکہ کے علماء اور کلچرل لیڈر ان باتوں سے باخبر ہیں۔ اور وُہ باہمی غلط فہمیوں کو دُور کرنے کی خلوص دلانہ کوشش کر رہے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ یہ لیڈر تعلیمی تبادلہ کے پروگراموں کی اِس قدر حمایت کرتے ہیں۔ امریکی چاہتے ہیں کہ غیر مُلکی آئیں اور امریکہ دیکھیں۔ امریکی گھروں میں جائیں۔ اور امریکی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ کریں۔ اس کے ساتھ ہی ہمارے کچھ بہترین طالب علم باہر جائیں اور دوسرے مُلکوں کے لوگوں کی زبانیں سیکھیں اور اُنکے کلچر کا مطالعہ کریں۔ ان لیڈروں کے ان نظریات کا پہلے سے ہی کافی اثر ہو رہا ہے۔ لیکن یہ اثر اُس وقت زیادہ کہرا ہوگا، جبکہ امریکیوں کی غیر مُلکوں کے لوگوں سے دوستی بڑھے گی۔ پیار ہوگا، اور وُہ ایک دوسرے کو بہتر سمجھنے لگیں گے۔

Entered in Database

Signature with Date

FEHRIST MAZAMBEN
G. K. U.